اسلام یہ نہیں ہے

علامہ محمد غزالیؒ

ترجمہ
مطلوب احمد قاسمی

البلاغ پبلی کیشنز
N-1 ابوالفضل انکلیو جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

اسلام یہ نہیں ہے

علامہ محمد غزالیؒ

ترجمہ

مطلوب احمد قاسمی

البلاغ پبلی کیشنز
N-1 ابوالفضل انکلیو جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

اسلام یہ نہیں ہے، تالیف شیخ محمد غزالی، ترجمہ: ابو مسعود اظہر ندوی
اشاعت دوم :۲۰۲۱
ناشر : اَلبَلاغ پبلی کیشنز N-1 ابوالفضل انکلیو جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
قیمت :۱۵۰ روپے

Name of Book : Islam yeh Nahin Hai
Author : Shaikh Muhammad Ghazali
Translated by : Abu Masud Azhar Nadwi
Published by : **Al-Balagh Publications**
Flat No.10, N-1, Abul Fazl Enclave
Jamia Nagar, New Delhi-110025
Mob. 9971477664
E-mail: abpublications@gmail.com

ISBN: 978-93-83313-84-6
Price: ₹150.00

ترتیب

باب:۴۔ بدعات عادات

خاتمہ کلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

الحمدلله رب العالمين والصلوة والسلام على خاتم النبيين.

اللہ تعالیٰ نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا اور اس کی صورت گری کی پھر اس میں اپنی روح پھونکی تو ایک متضاد مزاج کا وجود سامنے آیا جس کا ظاہری غلاف تو مٹی کا تھا مگر اس کے اندر اللہ تعالیٰ کے نور کی ایک کرن بھی تھی۔

یہ انسانی وجود متضاد صلاحیتوں کا حامل بنا۔ اس میں بلندی تک پہنچنے کی بھی صلاحیت تھی اور پستی میں گرنے کی بھی، سلامت روی کی بھی صلاحیت تھی اور بھٹکنے اور انحراف کرنے کی بھی۔

انا خلقنا الانسان من نطفة امشاج نبتليه فجعلناه سميعا بصيرا. ﴿الدهر:٢﴾

ہم نے انسان کو مخلوط نطفہ سے پیدا کیا اس طور پر کہ ہم اس کو مکلف بنائیں تو (اسی لیے) ہم نے اس کو سنتا دیکھتا (سمجھدار) بنایا۔

انسان میں زمینی و آسمانی دونوں رجحانات پائے جاتے ہیں کبھی ایک پہلو غالب آجاتا ہے کبھی دوسرا، کبھی خیر نمایاں رہتا ہے کبھی شر۔

دنیا میں انسان کا وجود ہے ہی اسی حقیقی امتحان کے لیے کہ کون نیک چلنی اختیار کرتا ہے اور کون بدچلنی، کون تقویٰ اختیار کرتا ہے اور کون فسق و فجور، کون اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور کون اسے ناراض کرنے کا راستہ منتخب کرتا ہے۔

الذى خلق الموت والحياة ليبلوكم ايكم احسن عملا ﴿الملك:٢﴾

جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون شخص عمل میں زیادہ اچھا ہے۔

انسان کو اسی حد تک پوری آزادی و اختیار دیا گیا ہے اور یہ خدائے رحمٰن و رحیم

سے محال ہی ہے کہ وہ اپنی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کوشاں لوگوں پر اپنا غضب نازل کرے یا جو اسے ناراض کرنے والی راہ پر چل رہا ہے اس سے راضی ہو جائے۔

فأما من طغى وآثر الحياة الدنيا فإن الجحيم هي المأوى وأما من خاف مقام ربه ونهى النفس عن الهوى فإن الجنة هي المأوى. ﴿النازعات:٣٧-٤١﴾

جس شخص نے (حق سے) سرکشی کی ہوگی اور (آخرت کا منکر ہو کر) دنیاوی زندگی کو ترجیح دی ہوگی سو جہنم اس کا ٹھکانا ہوگا اور جو شخص (دنیا میں) اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا ہوگا اور نفس کو (حرام) خواہش سے روکا ہوگا سو جنت اس کا ٹھکانا ہوگا۔

انسان کو یہی رہنمائی دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابیں اور رسول بھیجے:

قد جاءكم بصائر من ربكم فمن أبصر فلنفسه ومن عمي فعليها. ﴿الانعام:١٠٤﴾

اب بلا شبہ، تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے حق بینی کے ذرائع پہنچ چکے ہیں سو جو شخص دیکھ لے گا وہ اپنا فائدہ کرے گا اور جو شخص اندھا رہے گا وہ اپنا نقصان کرے گا۔

ونفس وما سواها فألهمها فجورها وتقواها قد أفلح من زكاها وقد خاب من دساها. ﴿الشمس:٧-١٠﴾

اور قسم ہے انسان کی جان کی اور اس (ذات) کی جس نے اس کو درست بنایا پھر اس کی بد کرداری اور پرہیزگاری (دونوں باتوں) کا اس کو القا کیا یقیناً وہ مراد کو پہنچا جس نے اس (جان) کو پاک کیا اور نامراد ہوا جس نے اس کو (فجور میں) دبا دیا۔

انسان کے اندر جو طبعی کمزوریاں چھپی ہوئی ہیں انہی کا فائدہ اٹھا کر اس کا ازلی دشمن شیطان اسے بہکانے کی ہمہ وقت کوشش کرتا رہتا ہے لیکن انسان اگر ہر وقت چوکنا رہے اور اپنے مقصود اور اپنے طرزِ عمل کا محاسبہ کرتا رہے تو شیطان اسے بہکانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ بلاشبہ:

ان الانسان خلق هلوعا اذا مسه الشر جزوعا واذا مسه الخير منوعا. ﴿المعارج:١٩-٢١﴾

انسان کم ہمت پیدا ہوا ہے جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو (حد سے زیادہ) جزع فزع کرنے لگتا ہے اور جب اس کو فارغ البالی ہوتی ہے تو (ضروری حقوق سے) بخل کرنے لگتا ہے۔

یہ لازمی ہے کہ انسان اپنے رب کو پہچانے اور پھر ہر طرح صاف ستھرا ہو کر

اس کی عبادت کرے۔

حضرت آدمؑ پر جب کمزوری اور بھول کا غلبہ ہوا تو وہ جنت کے معیار سے کم پر پہنچ گئے اس لیے وہاں سے ہٹا دیے گئے۔

حضرت آدمؑ کی اولاد کمزوری اور بھول کے ساتھ پھر جنت میں نہیں لوٹ سکتی۔ واضح رہے کہ پختہ ایمان اور عمل صالح ہی اسے پھر جنت میں پہنچا سکتے ہیں۔

قرآن کریم نہ صرف عقل کو مخاطب کرتا ہے اور نہ صرف دل وضمیر کو، بلکہ وہ پورے انسانی وجود کو مخاطب کرتا ہے وہ عقل کو مطمئن کرنے اور قلب کو حرکت میں لانے کا کام ساتھ ساتھ کرتا ہے جیسا کہ مشہور اسلامی مصنف عباس محمود عقادؒ لکھتے ہیں:

''اسلام صرف ضمیر ووجدان کو مخاطب نہیں کرتا بلکہ عقل کو خطاب کرتے ہوئے یہ ظاہر کرتا ہے کہ عقل کی آنکھوں سے دیکھ کر ہی ضمیر حقیقت تک پہنچ سکتا ہے غور وفکر کرنا ہدایت کا ایک دروازہ ہے جس سے ایمان حاصل ہوتا ہے۔

كذلك يبين الله لكم الآيات لعلكم تتفكرون. ﴿البقرة:۲۱۹﴾

اللہ تعالیٰ اس طرح احکام کو صاف صاف بیان فرماتا ہے تاکہ تم (دنیا و آخرت کے معاملوں میں) سوچ لیا کرو۔

یہ اسلامی عقیدہ کی جامعیت ہے کہ وہ روح وجسم اور عقل وضمیر کو ساتھ ساتھ مخاطب بناتے ہوئے کسی انسانی صلاحیت کو نظر انداز نہیں کرتا نہ کسی افراط وتفریط سے کام لیتا ہے۔

آج کل فلسفہ، ادب، اقتصادیات، طب اور سائنس وغیرہ زندگی سے متعلق علوم کو زیادہ سے زیادہ عوام کے سامنے لانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ کتابوں اور اخباروں ورسالوں نے ان علوم کو جو کبھی خاص لوگوں تک محدود تھے عوام سے کافی قریب کر دیا ہے۔ ایسی صورت حال میں عوام صرف اسلامی علوم ہی سے کیوں دور رہیں اور دین وشریعت کے احکام و مقاصد کی حکمت ومصلحت اور افادیت و ناگزیریت سے کیوں بیگانہ رہیں؟

اس کتاب میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ فنی اصطلاحات سے ممکن حد تک بچتے ہوئے آسان اسلوب میں دینی حقائق کو پیش کیا جائے۔

یہ کتاب شریعت کے اسرار کی تشریح نہیں بلکہ ان اضافوں کے تعلق سے تنبیہ و آگاہی ہے، جن کا اصلاً شریعت سے کوئی تعلق نہیں لیکن وہ دراندازہو کر اس کی تصویر بگاڑ رہے ہیں مقصد یہ ہے کہ لوگ عقائد، عبادات اور عادات کے سلسلے میں اس کی صحیح ہدایات کو سمجھ سکیں اور اپنے دین سے آگاہ ہو کر دینی خرافات کو سمجھ بوجھ کر ترک کر سکیں۔

علم کی اشاعت ہی اسلام کی خدمت کا بہترین راستہ ہے ملت کو بیدار کر کے ترقی کے راستے پر ڈالنے کے لیے عام سمجھ کا معیار بلند کرنا ہوگا۔

واللہ ولی التوفیق

محمد غزالی

باب ۔۱

دین میں اختراع

اسلام کے اصول وفروع کو جاننے اور دیکھنے والے حضرات اس دین میں اُن نئی باتوں کی دراندازی کو سمجھنے میں کوئی غلطی نہیں کریں گے جنھوں نے اس کی شفافیت کو گدلا کر دیا، اسے قابل نفرت بنا دیا اور پھر اصل حقیقت اور صورت دونوں کو نقصان پہنچایا۔

لوگوں کے ایجاد کردہ اضافے، جنھیں لوگوں نے اللہ کی شریعت کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہے ہمیں چند باتوں پر غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔

آخر کیا وجہ ہے کہ انسان اپنے پاس سے کچھ چیزیں دین میں شامل کر کے اسے دین ہی جیسی پاکیزگی عطا کرنا چاہتا ہے؟

کیا وہ اللہ کی نازل کردہ تعلیمات میں کوئی کمی دیکھتا ہے؟

اگر اس وجہ سے وہ نئی چیز تراشتا ہے تو وہ بلاشبہ احمق ترین شخص ہے۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے:

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔ ﴿المائدۃ:۳﴾	آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کیا۔

لہٰذا اگر کوئی یہ سمجھے کہ اسلامی تعلیمات میں کوئی کوتاہی یا کمی رہ گئی ہے جس میں مزید اضافہ کی ضرورت ہے تاکہ وہ سماج کی خوشحالی اور لوگوں کی اصلاح کے قابل ہو سکے تو وہ نرا جاہل ہے۔

لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ بدعت پسندوں کی اکثریت دین میں کمی سمجھ کر نہیں

بلکہ غلو کی وجہ سے نئی چیزیں داخل کرتی ہے۔

جبکہ غلو خواہ کسی چیز میں ہو ایسی چیز ہے کہ اس سے پھسل کر آدمی باہر نکل جاتا ہے۔

اور مبالغوں میں اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ حقیقت ختم ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ باطل اپنے پیر جمالیتا ہے۔

نصاریٰ نے غلو کیا تو اللہ کے ساتھ شرک کر بیٹھے اور دوسروں نے غلو کیا تو حلال کو حرام قرار دے دیا۔

نصاریٰ کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی:

یا اهل الکتاب لا تغلوا فی دینکم و لا تقولوا علی الله الا الحق ﴿المائدة:۱۷۱﴾	اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو نہ کرو اور نہ کہو اللہ پر مگر سچی بات۔

جبکہ دوسروں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی:

یا ایها الذین آمنوا لا تحرموا طیبات ما احل الله لکم و لا تعتدوا ﴿المائدة:۸۷﴾	اے ایمان والو! اللہ نے جو تمہارے لیے اچھی چیزیں حلال کی ہیں انہیں حرام نہ قرار دو اور تجاوز نہ کرو۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کو حکم دیا کہ وہ ایک طریقہ کو پوری طرح لازم پکڑ لیں اور اس سے ذرا بھی ادھر ادھر نہ ہوں۔

کیونکہ اگر اس راستے سے وہ ادھر اُدھر ہو گئے تو وہ کجی کی راہ پر چل پڑیں گے اور پھر آندھیاں انھیں لے جا کر دور دراز جگہوں پر پھینک دیں گی۔

وهذا صراط ربك مستقیما قد فصلنا الآیات لقوم یذکرون۔ ﴿الانعام:۱۲۶﴾	اور یہ تمہارے رب کا سیدھا راستہ ہے، ہم نے آیات کو تفصیل سے بیان کر دیا ہے یاد رکھنے والے لوگوں کے لیے۔

حضورؐ نے بہت سی حدیثوں میں سنت کو مضبوطی سے پکڑنے اور اپنے طریقے کی اتباع کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ اپنے خطبوں میں فرماتے تھے، ''بعد حمد وصلوۃ کے بہترین کلام اللہ کی کتاب ہے اور بہترین ہدایت محمد کی ہدایت ہے اور بدترین معاملہ نئی چیز پیدا کرنا ہے اور ہر نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت

گمراہی ہے"۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ فرمایا کرتے تھے کہ بے شک دو چیزیں ہیں کلام اور ہدایت تو بہترین کلام، اللہ کا کلام ہے اور بہترین ہدایت محمدؐ کی ہدایت ہے۔ مگر تم لوگ نئی چیزیں لاؤ گے اور نئی چیزیں تمہارے سامنے آئیں گی۔ لہٰذا ہر نئی چیز گمراہی ہے اور ہر گمراہی کا انجام جہنم ہے۔

یہ مذموم نیاپن اپنی صورت وشکل کے اعتبار سے چھوٹا اور بڑا ہوتا ہے اسی طرح سے اس سے پیدا ہونے والی کجی اور نقصان بھی کم اور زیادہ ہوتا ہے۔

علماء اسلام نے چھوٹی سی چھوٹی بدعت پر بھی نکیر کی ہے کیونکہ وہ بڑا دروازہ کھول سکتی ہے۔ آخر ایک چھوٹی سی چنگاری ہی بہت بڑی آگ کا سبب بنتی ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کے پہلو میں بیٹھے ہوئے ایک شخص کو چھینک آئی تو اُس نے کہا الحمدللہ والصلوۃ والسلام علی رسول اللہ۔ حضرت ابن عمرؓ نے اُس سے کہا رسولؐ خدا نے ہمیں چھینک کے وقت یہ نہیں سکھایا تھا بلکہ انھوں نے ہمیں یہ سکھایا تھا کہ صرف الحمدللہ کہیں۔

اس وجہ سے حضرت ابن عمرؓ اس زیادتی پر خاموش نہیں رہے جسے دوسرے لوگ بے ضرر کہہ کر ٹال جاتے بلکہ انھوں نے اُس شخص کو یہ بتانا ضروری سمجھا کہ وہ حضورؐ سے منقول سنت کی حدود پر قائم رہے بغیر کسی کمی یا زیادتی کے۔

کیونکہ اس قسم کی زیادتی کا دروازہ اگر ایک بار کھول دیا جاتا تو پھر غلو پسند لوگ چھینک کے وقت لمبی چوڑی دعاؤں اور پھر جواب میں اس سے بھی لمبی چوڑی دعاؤں کا سلسلہ شروع کر دیتے اور اس طرح یہ چھوٹی سی بات بہت بڑی بات بن جاتی۔

دراصل دین میں نئی چیز پیدا کرنے والا خود کو وہ مقام عطا کرتا ہے جس کا وہ حق دار نہیں ہے۔

کیونکہ اپنے تمام بندوں کے لیے شرعی قوانین تشکیل دینے والا صرف اور صرف اللہ عزوجل ہے۔

پھر کسی شخص کو ——— اس کی نیت اور قدر و منزلت کچھ بھی ہو ——— یہ جرأت کیسے ہو سکتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام میں اپنی طرف سے کوئی چیز شامل

کرے اور یہ کہے کہ یہ اچھی بات ہے اس کا کرنا اچھا اور چھوڑنا برا ہے جبکہ حکم نہ تو اللہ کا نازل کردہ تھا اور نہ ہی اس کے نبی کی سنت تھی۔

ام لهم شركاء شرعوا لهم من الدن مالم يا ذن به الله ولولا كلمة الفصل لقضى بينهم وان الظالمين لهم عذاب اليم ﴿الشوری: ۲۱﴾

کیا ان کے لیے شریک ہیں جنھوں نے ان کے لیے دین وضع کیا ہے جبکہ اللہ نے اس کا حکم نہیں دیا تھا اور اگر فیصلہ کی بات نہ ہوتی، ان کا فیصلہ کردیا جاتا اور بے شک ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے۔

دراصل الوہیت کا مقام حاصل کرنے کی اس خواہش میں انسان اپنی اوقات اور حدود کو پھلانگ جاتا ہے۔

اسی لیے ایسی چیزوں کو قبول کرنے اور اختیار کرنے کو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانے کے مترادف قرار دیا گیا ہے جو اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال اور حلال کردہ چیزوں کو حرام ٹھہراتی ہیں۔

ثعلب نے حضرت عدیؓ بن حاتم سے روایت کی ہے کہ میں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور میری گردن میں سونے کی صلیب پڑی تھی۔ آپؐ نے فرمایا، اے عدی اس بت کو اپنی گردن سے دور کردو۔

پھر میں نے آپ کو سورۂ برأت کی یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے سنا:

اتخذوا احبارهم ورهبانهم اربابا من دون الله ﴿توبة: ۳۱﴾

جنھوں نے اپنے عالموں اور درویشوں کو اللہ کے علاوہ معبود بنالیا ہے۔

میں نے کہا اے رسولؐ اللہ وہ ان کی پوجا نہیں کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کیا وہ اللہ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام نہیں قرار دیتے اور اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال نہیں قرار دیتے میں نے کہا بے شک۔ آپؐ نے فرمایا یہی ان کی عبادت ہے۔

علامہ آلوسیؒ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں، ''قرآن شریف کی یہ آیت بہت سے گمراہ فرقوں پر نکیر کرتی ہے جو اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت چھوڑ کر اپنے علماء اور روٴساء کے کلام کو اختیار کرلیتے ہیں۔

جبکہ اتباع کے قابل تو خدا کا برحق کلام ہے جب وہ آجائے تو ہر مسلم پر اس کی

اتباع لازمی ہے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ دین میں زیادتی خواہش نفس کی طرف جھکاؤ کا نتیجہ ہے اور مکمل اتباع کا ترک صحیح راہ سے ہٹ جانا ہے۔ خدا کا ارشاد ہے:

فماذا بعد الحق الا الضلال فانی تصرفون ﴿یونس: ۳۱﴾ حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا ہے پھر تم کہاں پلٹے جا رہے ہو۔

جو لوگ ان بدعات کو ایجاد کرتے ہیں وہ اپنی گمراہی کا بوجھ تو اٹھاتے ہی ہیں ساتھ میں اُن کا بھی بوجھ اٹھاتے ہیں جو ان کے فریب میں آ کر ان کی راہ پر چل پڑتے ہیں۔

ایک حدیث میں صاف طور سے کہا گیا ہے۔ جس نے کوئی برا طریقہ ایجاد کیا تو اس پر اس کا اپنا بوجھ ہوگا اور اُن کا بھی بوجھ ہوگا جو اس پر عمل کرتے ہیں۔

خدا تعالیٰ کا فرمان ہے:

لیحملوا اوزارھم کاملة یوم القیامة ومن اوزار الذین یضلونھم بغیر علم ﴿النحل: ۲۵﴾ تا کہ وہ اٹھائیں اپنا پورا بوجھ قیامت کے دن اور ان لوگوں کا بوجھ بھی جنھیں وہ انجانے میں گمراہ کر رہے ہیں۔

عبادت کا تعلق دل سے ہوتا ہے۔ جس کے ایک گوشہ میں وہ قرار پکڑتی ہے پھر ادائیگی پر آمادہ کرتی ہے۔ کسی فرد واحد میں دو دل نہیں ہوتے جس میں دو الگ الگ چیزیں قرار پکڑ سکیں۔

اس لیے انسان دو ہی حالتوں میں رہ سکتا ہے یا تو وہ اپنے قلب میں سنت کو جاگزیں کرلے اور یا پھر بدعت کی طرف مائل ہو جائے۔

ان دونوں میں سے وہ جس راستے کا انتخاب کرے گا وہ دوسرے راستے کی قیمت پر ہوگا۔ لہٰذا جو شخص بدعت اور خرافات میں جس قدر منہمک ہوگا وہ اسلام کے محکم فرائض اور صحیح حقائق کو اتنا ہی ضائع کردے گا۔

اس طرح بدعت صرف حقیقت کے خوشنما چہرے کو داغدار ہی نہیں کرتی بلکہ یہ ایک مرض کی طرح قلب کے اس گوشے پر حملہ آور ہوتی ہے جس میں دین کا مستقر ہوتا ہے اور پھر اسے تاخت وتاراج کر ڈالتی ہے۔

اسی لیے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کا کہنا ہے کہ سنت میں کمی بدعت کی مشقت سے بہتر ہے۔ اُن کا یہ بھی کہنا ہے کہ لوگ جس قدر بدعات ایجاد کرتے ہیں اتنی ہی سنتیں ضائع کردیتے ہیں۔

ابوداؤد نے حضرت معاذؓ ابن جبل سے روایت کی ہے کہ انھوں نے ایک دن فرمایا، تمہارے پیچھے فتنے ہیں، جن میں مال کی کثرت ہوگی اور قرآن کھلے ہوئے ہوں گے۔ یہاں تک کہ ان میں مومن بھی مبتلا ہوگا اور منافق بھی، مرد بھی اور عورت بھی، چھوٹا بھی بڑا بھی، غلام بھی اور آزاد بھی۔

ایسے میں ایک شخص کہے گا، لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ میری اتباع نہیں کرتے جبکہ میں نے قرآن کا علم حاصل کیا ہے، وہ میری اتباع اس وقت تک نہیں کریں گے جب تک کہ میں ان کے سامنے کوئی نئی چیز پیش نہ کروں، لہٰذا خبردار تم اس کی نئی چیز سے ہوشیار رہنا کیونکہ اس کی یہ نئی چیز گمراہی ہوگی۔ میں اس عقل مند شخص کی کج روی سے تمہیں خبردار کرتا ہوں۔ کیونکہ شیطان کبھی کبھی عقل مند آدمی کی زبان سے گمراہی کے کلمات کہلواتا ہے اور کبھی کبھی منافق شخص بھی برحق بات کہہ جاتا ہے۔

حضرت معاذؓ بن جبل کے مذکورہ بالا کلمات ہمارے سامنے اس حقیقت کو پیش کرتے ہیں کہ کس طرح کچھ اہل دین حضرات خاص طور سے ہمارے صوفیاء کرام نے عام لوگوں کے لیے مخصوص وظائف واذکار وضع کیے اور پھر انھیں عوام کے سامنے اس طرح پیش کیا جس طرح ایک جاہل حکیم خراب دوائیں مریض کو دیتا ہے۔ پھر ان وظائف واوراد پر اپنے سربرآوردہ لوگوں کے مشورے پر لوگ ٹوٹ پڑتے ہیں اور اللہ کے فرائض ونوافل کو چھوڑ کر ان بے کار چیزوں میں اپنا وقت برباد کرنے لگتے ہیں۔

یہ لوگ جس قدر ان ایجاد کردہ وظائف میں مشغول ہوتے ہیں اسی قدر اسلام کے ان صحیح مقاصد کو فراموش کردیتے ہیں، جو ان کے دلوں کو شفاء بخشتے اور ان کے سروں کو بلند کرتے ہیں۔

ابوداؤد نے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک شخص نے حضرت عمرؒ بن عبدلعزیز سے قضاوقدر کا مسئلہ دریافت کیا، جس کے جواب میں انھوں نے تحریر فرمایا، تمہارے لیے میری نصیحت یہ ہے کہ تم اللہ سے ڈرو، اس کے احکامات میں میانہ روی اختیار کرو، اس

کے نبی کی سنت کی اتباع کرو نبی کی سنت کے بجائے لوگوں کی خود ساختہ بدعت کو چھوڑ دو اور اس کی معاونت سے باز رہو۔ تم سنت کو لازم پکڑ لو یہ چیز تمہیں اللہ کے حکم سے تمام خرافات سے محفوظ رکھے گی۔

پھر تم اس حقیقت کو بھی جان لو کہ لوگوں کی ایجاد کردہ ہر بدعت کے خلاف ماضی کی کوئی حجت یا عبرت موجود ہوتی ہے۔

کیونکہ سنت بنانے والے کو تو اس کی خلاف ورزی کی صورت میں غلطی، لغزش، بے وقوفی اور گڈھے میں گر جانے کا پورا پورا علم تھا۔

لہٰذا تم اپنے لیے اسی چیز کو پسند کرو جسے قوم نے اپنے لیے پسند کیا تھا۔ کیونکہ وہ جانتے بوجھتے ہوئے رک گئے تھے اور دیکھتے سنتے ہوئے باز رہے تھے۔

وہ لوگ حقیقت کا ادراک کرنے کے بعد بڑے مضبوط تھے اور جو کچھ کر رہے تھے، بہت ہی بہتر کر رہے تھے...... الخ۔

آخر وہ کون لوگ تھے جن کی طرف حضرت عمرؓ ابن عبدالعزیز اشارہ کر رہے تھے، بلاشبہ ان کا اشارہ اصحابؓ رسول کی طرف تھا جو اپنے نبی کی ہدایت پر عمل پیرا تھے، ان کے نقش قدم پر گامزن تھے بغیر کسی کجی یا ٹیڑھے پن کے۔

مگر کچھ لوگوں کو تو ایجاد و اختراع سے محبت ہے۔

وہ شوق سے ایسا کر سکتے ہیں، اسلام اس کی اجازت دیتا ہے۔

مگر شرط یہ ہے کہ یہ ایجاد مخصوص میدان میں ہو۔ اس پر کوئی روک نہیں ہے۔ یہ ایجاد امور دنیا میں ہو جس کا افق انتہائی وسیع وعریض ہے بلکہ اس میں طرح طرح کی ایجادات نہایت ضروری ہیں۔ اور جس کا جو جی چاہے ایجاد کرلے کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔

غیروں نے اس وادی میں قدم رکھا اور نئی نئی ایجادات کیں۔ خود بھی مستفید ہوئے اور لوگوں کو بھی فائدہ پہنچایا۔

مگر ہم نے تو دین میں جمود اختیار کرنے اور دنیاوی امور میں ایجادات کرنے کے بجائے قرآنی احکام کے برعکس کام کیا۔ دین میں بے معنی چیزیں ایجاد کیں اور دنیاوی امور میں جامد ہو کر رہ گئے۔

لوگ زمین و آسمان کے درمیان فضا میں پرواز کر رہے ہیں اور ہم ابھی تک زمین پر رینگ رہے ہیں۔

کیوں نہ ہم قرآنی آیات پر عمل کرتے ہوئے ان میدانوں میں اپنے گھوڑے دوڑائیں، جنھیں ہماری عقلوں اور کوششوں کی جولان گاہ بنایا گیا ہے۔ کیا یہ ہمارے دین کے لیے زیادہ صحت منداور ہماری زندگیوں کے لیے زیادہ مناسب نہیں ہوگا؟

کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی عمل کو اچھا سمجھے، پھر اس پر دین کا ٹھپہ لگائے اور لوگوں میں یہ کہہ کے رواج دے دے کہ رب العالمین کی طرف سے ہے اور اس طرح بھولے بھالے لوگوں کو یہ باور کرائے کہ اس کا کرنا ثواب اور چھوڑنا گناہ ہے۔

درحقیقت بہتان یہی ہے، خواہ نیت وارادہ صحیح ہی کیوں نہ ہو اور اضافہ شدہ عمل کی نوعیت کچھ بھی ہو۔

اسی سلسلہ میں آثار وارد ہوئے ہیں جنھیں کچھ لوگوں نے سمجھنے میں غلطی کی اور یہ سمجھ بیٹھے کہ کچھ اچھے اعمال ایجاد کرنے اور رواج دینے کی اجازت ہے کیونکہ ان کے خیال میں یہ اللہ سے تقرب حاصل کرنے کے مشروع ذرائع ہیں۔

ان کے سامنے شاید حضورؐ کی یہ حدیث ہے:

من سن سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها لا ينقص ذلك من اجور هم شيئا.

جس نے کوئی اچھی سنت ایجاد کی اس کو اس کا ثواب ملے گا اور ان کا بھی ثواب ملے گا جنھوں نے اس پر عمل کیا اور اس کے لیے ان کے ثواب میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔

اس کے علاوہ ان کے مدنظر حضورؐ سے منسوب یہ دوسری روایت بھی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا ہے "جسے عام مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہے"۔

پہلی حدیث امام مسلم نے روایت کی ہے جو کسی بھی طرح یہ نہیں بتاتی ہے کہ دین میں ایجاد واختراع جائز ہے۔

کیونکہ کوئی بھی اچھی سنت ایسی نہیں ہے جو کتاب اللہ وسنت رسول اللہ سے

منظور شدہ نہ ہو۔

یہ حدیث بھی حضور کی ایک دوسری حدیث کی طرح ہے جس میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ جس نے ہدایت کی طرف بلایا تو اس کو اس کا اجر ملے گا اور جن لوگوں نے اس پر عمل کیا ہے۔ اس کا بھی اجر ملے گا اور ان کے اجر میں سے کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔

اس سے ملتی جلتی ایک دوسری حدیث ہے جس میں آپؐ نے فرمایا ہے، ''نیکی کی راہ دکھانے والا اس کے کرنے والے ہی کی طرح ہے''۔

تو جس ہدایت کی طرف دعوت دی جا رہی ہے وہ سنت حسنہ ہے اور یہی وہ خیر کا راستہ ہے جس پر چل کر بندے اللہ کی رضا حاصل کرتے ہیں۔

ہدایت یہ نہیں ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ باور کریں کہ ان سے یہ فروگذاشت ہوگئی یا اس کے رسولؐ سے چوک ہوگئی۔

بے شک کچھ ایسے رہنما مبادیات ہیں، جن کے نفاذ کا دائرہ کار وسیع بنایا جا سکتا ہے، اس کے قیام کے ذرائع میں تنوع پیدا کیا جا سکتا ہے اور زمانہ کے نتیجے میں اس سے استنباط کے وسائل کو زمانہ جدید سے ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے۔

بے شک اس قسم کے رہنما اصولوں میں خامہ فرسائی عقل و دانش کی مسابقت آرائی اور ایجاد و اختراع کے لیے وسیع میدان موجود ہے۔

ان چیزوں کو دین میں اختراع یا سنت سے خروج کا نام نہیں دیا جائے گا۔ گو کہ ہمارے پیش رو اسلاف نے یہ کام نہیں کیا ہو کیونکہ ان کے زمانہ میں اس کی ضرورت نہیں پڑی تھی یا صورت حال اس کی متقاضی نہ ہوئی ہو۔

لہٰذا سنت حسنہ یا تو وہ اللہ کی وحی سے ماخوذ ہوگی یا اس کے نبی کی ہدایت سے ماخوذ ہوگی یا کوئی ایسا عمل ہوگا جس کا سرچشمہ یہی دونوں ہوں گے۔

☆☆☆

جہاں تک اس حدیث کا تعلق ہے کہ جسے مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہے تو یہ حضور کی کوئی حدیث نہیں ہے بلکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا کلام ہے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ ایک جلیل القدر صحابی اور زبردست فقیہ تھے، ان کا کلام ہمیں غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔

یہ بات طے شدہ ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے مذکورہ بالا کلام کا مقصد اس امت کو کتاب اللہ میں کمی یا زیادتی کا حق دینا نہیں تھا۔

کیونکہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کا شمار دینی معاملات میں کسی بھی کجی کے خلاف حساس ترین صحابہؓ میں ہوتا تھا۔ وہ بدعت کے خلاف شمشیر برہنہ تھے۔ خواہ بدعت چھوٹی ہو یا بڑی، اسے پنپنے اور پھلنے پھولنے کا موقع ہی نہیں دیتے تھے بلکہ بدعت کو اس کے اصل گہوارہ ہی میں نیست و نابود کر دیتے تھے۔

پھر ایسے شخص کے ملفوظات کو دین میں اختراع کے لیے ڈھال کیسے بنایا جا سکتا ہے؟

بہت ممکن ہے کہ مذکورہ بالا کلمات سے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی مراد صحابہؓ کرام اور تابعینؒ کرام کے اجماع کی تحسین رہی ہو اس امید پر کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک قابل قبول حق عام مسلمانوں سے فوت نہیں ہو پائے گا یا اس سے ان کی مراد اسلام کے عظیم مقاصد کے لیے اُن وسائل کا استعمال ہو جن کے اصول وضوابط کا تعین نہ ہوا ہو۔

یا اس سے ان کی مراد روزمرہ کے وہ معاملات ہوں جن کا دین سے قصد ونیت کے علاوہ اور کوئی تعلق نہ ہو۔

☆☆☆

دین میں اضافہ کو قبول کرنا اور وہ بھی اس دعویٰ کے ساتھ کہ یہ بہت ہی اچھی باتیں ہیں بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ دین کی کچھ باتوں کو ختم کر دینا۔ یہ کہہ کر کہ یہ خراب چیزیں ہیں یا یہ ترقی پذیر دنیا کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہیں۔ یہ دونوں باتیں سراسر گمراہی ہیں۔

جس طرح شریعت سے کوئی حکم ساقط نہیں کیا جا سکتا اسی طرح جن باتوں سے اللہ نے سکوت فرمایا ہے انھیں شریعت میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

حدیث نبوی ہے، "اللہ تعالیٰ نے فرائض عائد کیے ہیں انھیں ضائع نہ کرو،

اور حدود متعین کیے ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو اور کچھ چیزیں حرام فرمائی ہیں ان کو پھلانگو نہیں اور کچھ چیزوں پر سکوت فرمایا ہے، تمہارے اوپر رحم کر کے۔

حضرت مالک بن انسؒ کہتے ہیں کہ جس نے بدعت کو مستحسن سمجھا اس نے یہ گمان کیا کہ حضورؐ نے رسالت کو پہنچانے میں خیانت کی ہے۔

امام شافعیؒ کا کہنا ہے کہ اگر میں کسی صاحب بدعت کو ہوا میں اڑتے بھی دیکھوں تب بھی اسے قبول نہیں کروں گا۔

ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ جس نے بدعت کو اچھا سمجھا اس نے گویا شریعت بنائی۔

ان کا ایک قول یہ بھی ہے کہ جو اختراع کتاب، سنت، آثار یا اجماع کے خلاف ہو وہ بدعت و گمراہی ہے۔

امام شافعیؒ کے استاذ وکیعؒ کا کہنا ہے کہ میرے لیے اس بات سے کم سنگین جرم ہے کہ مجھ سے بدعتی کی حیثیت سے باز پرس کی جائے۔

تمام مذاہب عالم کو لوگوں کی سرکشی سے اتنا نقصان نہیں پہنچا ہے جتنا کہ ان کی نصوص سے کھلواڑ کرنے، خواہشات کے مطابق انھیں موڑنے اور ان میں خرافات اور واہیات چیزوں کو داخل کرنے سے پہنچا ہے تاکہ لوگ انھیں دھوکہ اور غفلت سے اختیار کرلیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف کی حفاظت فرمائی ہے جس کی وجہ سے اس میں تحریف و تبدیلی نہیں ہوسکی۔

سنت نبوی کو مخلص نقاد مل گئے جنھوں نے اس میں خرافات نہیں داخل ہونے دی اور حدیث گھڑنے والوں کو دور رکھا۔

اس طرح اسلام مکمل طور سے محفوظ و مامون رہا کیونکہ ہر نسل میں اس کو ایسے نگہبان ملتے رہے جنھوں نے اس میں خرافات کو داخل نہیں ہونے دیا اور اس کی پاکیزگی کو در انداز ہونے والی گندگیوں سے محفوظ رکھا۔

قدیم مذاہب ختم ہو گئے کیونکہ خواہشات نے ان کے اصولوں کو بدل ڈالا۔ صرف ان کا نام باقی رہا مگر حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہ رہ گیا۔

لیکن خدا کے فضل سے اسلام کا حال جداگانہ ہے۔ اس امت میں بدعتیں

پھیلیں مگر راسخ علماء نے جلد ہی انھیں بے نقاب کر دیا۔

ان کی کوششوں کی بدولت حق و باطل دودھ اور پانی کی طرح الگ الگ ہو گئے۔

اگر اس باطل کو تھوڑی بہت زندگی بھی ملی تو وہ بھی گھٹن اور بے عزتی کے ساتھ۔

ہمارے ائمہ کرام نے اپنا پہلا فریضہ اس بات کو سمجھا کہ وہ لوگوں تک اسی خالص اور اصل اسلام کو پہنچائیں جسے اس کے سب سے پہلے مبلغ صلی اللہ علیہ وسلم لیکر آئے تھے۔

حضرت عبدؓاللہ ابن مسعود کہتے ہیں کہ ''تم علم کو لازم پکڑ لو قبل اس کے کہ وہ قبض کر لیا جائے اور اس کا قبض اس طرح ہوتا ہے کہ وہ صاحب علم کے ساتھ رخصت ہو جائے، تم علم کو لازم پکڑ لو کیونکہ تم میں سے کسی کو یہ معلوم نہیں ہے کہ صاحب علم کے پاس جو کچھ ہے اس کی ضرورت کب پڑ جائے۔

تم عنقریب ایسے لوگوں سے ملو گے جو بزعم خود تمہیں کتاب اللہ کی طرف بلائیں گے جبکہ کتاب اللہ کو وہ پس پشت ڈال چکے ہوں گے۔ لہٰذا تم علم کو لازم پکڑ لو اور خبر دار بدعت سے دور رہنا، خبر دار ملمع سازی سے دور رہنا، خبر دار موشگافی سے دور رہنا اور قدیم آثار کو لازم پکڑ لینا۔

عمرو بن یحیٰ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ ہم لوگ حضرت عبدؓاللہ ابن مسعود کے دروازے پر فجر کی نماز سے پہلے جا کر بیٹھ جاتے تھے۔ پھر جب وہ نکلتے تھے تو ہم ان کے ساتھ مسجد جایا کرتے تھے۔

ایک روز حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ ہمارے پاس آئے اور پوچھا کیا ابو عبدالرحمٰن نکل چکے ہیں؟ ہم نے جواب دیا نہیں۔ یہ سن کر وہ بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گئے۔ جب حضرت ابن مسعودؓ باہر نکلے تو ہم سب کھڑے ہو گئے اور ان کے ہمراہ چلنے لگے۔ راستے میں ان سے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے کہا اے ابو عبدالرحمٰن مسجد میں میں نے کچھ عجیب و غریب شے دیکھی مگر میرے خیال میں الحمد للہ وہ نیکی ہی تھی۔

انھوں نے دریافت کیا آخر وہ کیا چیز تھی؟ حضرت ابو موسیٰؓ نے جواب دیا ابھی تھوڑی دیر میں آپ خود ہی دیکھ لیں گے۔

پھر حضرت ابو موسیٰؓ نے بتایا کہ مسجد میں، میں نے کچھ لوگوں کو نماز کے انتظار

میں حلقے بنا کر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ سب کے ہاتھوں میں کنکریاں تھیں۔ ہر حلقہ میں ایک شخص کہتا سو بار تکبیر پڑھو تو سب لوگ سو بار تکبیر پڑھتے۔ پھر وہ کہتا، سو بار لا الہ الا اللہ پڑھو تو وہ لوگ سو بار پڑھتے۔ پھر وہ کہتا اب سو بار تسبیح پڑھو تو سب لوگ سو بار تسبیح پڑھتے۔

حضرت ابن مسعودؓ نے دریافت کیا کہ پھر آپ نے ان سے کیا کہا؟ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے جواب دیا کہ میں نے انھیں کچھ نہیں کہا۔ آپ کی رائے اور حکم کا انتظار کر رہا تھا۔

حضرت ابن مسعودؓ نے کہا آپ نے انھیں اس بات کا حکم کیوں نہیں دیا کہ وہ اپنی برائیوں کو شمار کریں اور میں اس بات کی ضمانت دیتے گا کہ ان کی نیکیاں ضائع نہیں کی جائیں گی؟

پھر وہ چلتے رہے، ہم بھی ان کے ساتھ چلتے رہے، یہاں تک کہ وہ ان کے ایک حلقے کے قریب کھڑے ہو گئے اور کہا میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں؟

انھوں نے کہا اے ابوعبدالرحمٰن یہ کنکریاں ہیں، جن پر ہم تکبیر تہلیل اور تسبیح شمار کر رہے ہیں۔ اس پر انھوں نے کہا، تم اپنے گناہوں کا شمار کرو، میں ضمانت دیتا ہوں کہ تمہاری نیکیوں میں کوئی کمی نہ ہوگی۔

اے امت محمدیہ! تمہاری ہلاکت کتنی جلد آ گئی، تمہارے نبیؐ کے صحابہ ابھی موجود ہیں، تمہارے نبیؐ کے کفن کے کپڑے ابھی بوسیدہ نہیں ہوئے ہیں، ان کے برتن ابھی ٹوٹے نہیں ہیں۔ قسم اللہ کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، کیا تم ملت محمدیہ سے زیادہ ہدایت یافتہ ہو یا تم گمراہی کا دروازہ کھول رہے ہو؟

انھوں نے کہا قسم خدا کی اے ابوعبدالرحمٰن ہم نے تو صرف خیر ہی کا ارادہ کیا تھا۔ انھوں نے جواب دیا، کتنے لوگ خیر کا ارادہ کرتے ہیں، مگر انھیں خیر ملتا نہیں ہے۔

حضورؐ نے ہمیں یہ بتایا تھا کہ کچھ لوگ قرآن پڑھتے ہیں، مگر قرآن ان کی حلق سے آگے نہیں جاتا۔ قسم اللہ کی میرے خیال میں تمہاری اکثریت انھیں لوگوں میں سے ہے۔ یہ کہہ کر وہ ان کے پاس سے چلے گئے۔

اس کے بعد عمرو بن سلمہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ان حلقہ بند لوگوں کی

اکثریت کو خوارج کے ساتھ ہمارے خلاف جنگ کرتے ہوئے دیکھا۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے یہ بھی فرمایا تھا: تم اتباع کرو اور بدعت نہ ایجاد کرو، بس اتنا ہی کافی ہے۔

☆☆☆

چنانچہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے حضورؐ کے زمانہ میں غیر موجود اس ذرا سے اضافہ کو بھی برداشت نہیں کیا اور اس کی فوراً ہی بیخ کنی کردی۔

اللہ کے ذکر میں منہمک ان لوگوں کے دلوں میں غلو کا بیج نشو ونما پاتا رہا جو انجام کار انھیں انتہا پسندی کی طرف لے گیا اور پھر انھوں نے دیگر مسلمانوں پر کفر کا بہتان باندھا۔

پھر مسلمانوں کی جماعت نے ان انتہا پسند خوارج سے جنگ کی، ان کی طاقت توڑ دی مگر ان کے نظریات کی بیخ کنی نہ کر سکی۔

☆☆☆

اختراع کے ماحول میں نشو ونما پاتے ہوئے یہی بیج تھے جنھوں نے ذکر کی مجلسوں کو وجد سے مخمور لوگوں کے رقص میں بدل دیا اور اس دعویٰ کے ساتھ کہ ان پر حضرت القدس جبرئیل کا عکس پڑ رہا تھا۔

بدعت کی بیخ کنی کے لیے صرف ایک ہی آواز کافی نہیں ہوگی۔ لوگوں کو اس کی طرف حق صریح اور دین خالص کہہ کے بلایا جاتا ہے تا کہ اس ملمع سازی کو وہ اپنی متاع گم شدہ سمجھ کے قبول کرلیں۔

اور آپ یہ دیکھ کے ششدر رہ جائیں گے کہ اس مخلوط شے کے ساتھ جہالت، اس سے الفت اور تعصب اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ لوگ اس کو اصل دین سمجھنے لگتے ہیں اور بقیہ چیزوں کو بکواس۔

اس موقع پر حضرت عمرؒ ابن عبدالعزیز کی بات بھی سنتے چلئے جنھیں بدعت کے خلاف جنگ میں سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ کہتے ہیں، ''میں ایک ایسی مہم سے نبرد آزما ہوں جس میں بڑے ختم ہو گئے، بچے بوڑھے ہو گئے، عجمیوں نے فصاحت کے جوہر دکھائے اور اعرابیوں نے اس پر علیحدگی اختیار کر لی ہے۔ یہاں

تک کہ اسی کو وہ دین سمجھنے لگے ہیں اور اب اس کے علاوہ کسی اور چیز کو حق مانتے ہی نہیں ہیں۔

اب آپ خود ہی اندازہ لگایئے، اگر حضرت عمرؒ ابن عبدالعزیزؒ کے زمانہ میں بدعت اس قدر پیر جما چکی تھی تو پھر بعد میں کیا حال ہوا ہوگا؟

بدعت کیا ہے؟

علماء نے بدعت کی تعریف اس طرح کی ہے، ''دین میں من گھڑت طریقہ، شریعت کی ہو بہو نقل اور بظاہر مقصد بھی وہی جو شریعت کا ہوتا ہے یا اس طریقہ پر چل کر اللہ کی عبادت میں مبالغہ یا کثرت'' اور اختراع کا مطلب ہوتا ہے، ''کسی ایسی نئی بات کا پیدا کرنا جس سے لوگ نا آشنا ہوں''۔

یورپ کے پڑھے لکھے لوگوں نے تو ہوائی جہاز، ریل، ریڈیو اور ٹیلیویژن وغیرہ ایجاد کر ڈالے۔ اس فن میں انھوں نے جدت پیدا کی جس سے پچھلے لوگ نا آشنا تھے۔ اس میدان میں ان کی اختراع قابل تعریف ہے۔

لیکن جو لوگ اقوال اور اعمال گھڑتے ہیں اور پھر اس میں ایسی چاشنی ملاتے ہیں کہ لوگ اسے دین سمجھنے لگیں، بے شک یہی بدعتی ہیں، جو اپنی طرف سے وضع کر کے ایسی چیزیں پیش کرتے ہیں جو نہ تو اللہ نے نازل کی ہیں اور نہ ہی یہ باتیں اس کے نبی کو معلوم تھیں۔

تو اصل بدعت وہ تخلیق ہے جس کی نہ تو کوئی سابقہ مثال ہو اور نہ ہی کوئی واضح دلیل ہو۔ اسی لیے تو اللہ تعالیٰ کو بدیع کہا جاتا ہے، کیونکہ اس نے اس عظیم الشان دنیا کو بغیر سابق نظیر و مثال کے بنایا ہے:

بدیع السموات والارض واذا قضی امرا فانما یقول له کن فیکون۔ ﴿بقرة:۱۱۷﴾	آسمانوں اور زمین کا بنانے والا اور جب کسی امر کا فیصلہ کرتا ہے تو اس سے کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔

جب کوئی شخص کسی شے کو دین بنانے کے لیے وضع کرتا ہے تو وہ اپنے پُر فریب باطل کو اس طرح بنتا ہے کہ دیکھنے والے اس کے باطل کو حق سمجھنے لگتے ہیں۔

اسی لیے اس کی پوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کی وضع کردہ چیز دیکھنے میں بالکل شریعت لگے، اگرچہ اس کا جوہر اور اصل شریعت کے مخالف ہو۔

بدعت کو رواج دینے والے اور کھوٹے سکے بنانے والوں میں کس قدر مشابہت ہے۔

یہ کھوٹے سکے بنانے والے اپنے جعلی سکوں کا رنگ اور وضع قطع بالکل اصلی سکوں جیسی رکھتے ہیں تاکہ وہ دیکھنے میں اصل معلوم ہوں اور سادہ لوح افراد دھوکہ کھا جائیں۔

جب یہ جعلی سکے ڈھالے جاتے ہیں تو ان میں زیادہ کھوٹی معدنیات کے ساتھ ساتھ تھوڑی سی اصلی چیز بھی شامل کر دی جاتی ہے تاکہ وہ شکل وصورت سے اصلی سکے نظر آئیں اور لوگ اصل ونقل میں تمیز نہ کر سکیں۔

اسلام کے اولین ائمہ حضرات بدعت کو ڈھونڈ ڈھونڈ کے اس کا قلعہ قمع کرتے رہتے تھے، بالکل اسی طرح جس طرح کہ آج کل کی حکومتیں ڈھونڈ ڈھونڈ کے کھوٹے سکوں کو ضائع کرتی رہتی ہیں اور ان کے بنانے والے اور چلانے والے مجرموں کو سزا دیتی ہیں۔

اسلام کے اولین ائمہ حضرات کے نزدیک حضورؐ کا یہ ارشاد تھا، ''جس نے ہمارے اس امر میں کوئی ایسی چیز ایجاد کی جو اس میں نہیں تھی وہ رد ہے''۔ اسی طرح حضورؐ کا دوسرا قول ہے، ''جس نے ایسا کام کیا جس پر ہمارا امر نہیں تھا وہ رد ہے''۔

درحقیقت یہ دونوں حدیثیں بدعت کے خلاف اعلان جنگ ہیں۔ پہلی حدیث بدعت کی ایجاد کے خلاف اور دوسری اس کی قبولیت اور اس پر عمل کے خلاف۔

اگر جعلی کرنسی کے خلاف جاری جدوجہد کا دسواں حصہ بھی بدعت کے خلاف چلایا جاتا تو اسلام کا جوہر بڑا صاف ستھرا باقی رہتا، جسے لوگ بصد شوق وذوق قبول کرتے اور اس پر عمل پیرا ہوتے۔

لیکن افسوس کہ لوگوں کو معاش کی زیادہ فکر ہوتی ہے جس کی حفاظت اور بقاء کے لیے وہ ہمہ وقت کمر بستہ رہتے ہیں۔

لیکن دین کو وہ خاطر خواہ اہمیت نہیں دیتے جس کے نتیجے میں بدعات کا رواج

ہوا، یہاں تک کہ حق پگھل کے نیست و نابود ہونے کے قریب پہنچ گیا۔

اسلام کے دشمنوں نے ان بدعات کی نشو و نما اور پروان چڑھانے میں تن من دھن لگا دیا اور ناواقف آنکھوں کے سامنے اسے اس طرح پیش کیا جیسے وہی اصل دین ہو۔

اور پھر اسی مقام پر آ کر ذوق سلیم اور خالص فطرت والے لوگ واپس لوٹ جاتے ہیں۔

اگر آپ کو اسلام اور مسلمانوں میں موجود اس شر کی کرشمہ سازی دیکھنا ہو تو ''ٹائمز'' کی رپورٹ ملاحظہ فرمائیں جس میں ''استعمار اور اسلام'' کے عنوان کے تحت یہ اخبار رقم طراز ہے:

''اسلام مغربی افریقہ میں تیزی سے قدم جما رہا ہے جس کی وجہ سے عیسائی مشنریوں اور یورپ کو اس بات سے شدید پریشانی ہو رہی ہے کہ کہیں اسلام اس پورے خطہ میں نہ پھیل جائے۔

پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ اسلام صحرائی قوموں کا مذہب ہے اور متمدن آبادی کی طرف کم دھیان دیتا ہے لیکن موجودہ صورت حال بتاتی ہے کہ اسلام کا دائرہ کار وسیع ہوتا جا رہا ہے۔

آج کوئی اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوگا کہ وہ استوائی علاقوں کو زیر کرتا ہوا جنوب تک پہنچ جائے گا جیسا کہ سیرالیون، آوری کوسٹ، گھانا اور داہومی میں ہوا ہے''۔

یہاں کے ارباب حل وعقد کو خاص طور سے یہ خوف کھائے جا رہا ہے کہ اس علاقہ میں اسلام کی نشر و اشاعت قاہرہ اور عالم عرب کے ساتھ روابط کے نتیجہ میں ہوئی ہے۔

افریقہ میں اسلام کے مستقبل کے بارے میں یورپی مفکرین کے انداز فکر میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

کچھ مفکرین کا کہنا ہے کہ اسلام کی پیش قدمی استعماری مصالح کے لیے اُس وقت تک خطرہ نہیں بنے گی جب تک کہ وہ استعماری طاقتوں کی کھینچی ہوئی لکیروں پر

چلتی رہے گی۔

جبکہ دیگر مفکرین کا خیال ہے کہ اسلام کی پیش قدمی کو ان میں بدعت اور دیگر خرافات پھیلا کے روک دینا چاہیے تا کہ اسلام کے بڑھتے ہوئے دباؤ کے سامنے یہ حد فاصل کا کام کرے''۔

آپ نے دیکھا کہ بدعت کس طرح اسلام کے سامنے رکاوٹ کا ایک پتھر ہے؟ کس طرح اس کی طاقت کو کمزور بناتی ہے اور اس کی شان وشوکت کو ملیا میٹ کرتی ہے؟

بدعت کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ وہ ہو بہو نقلی تجارتی مال کی طرح ہے جسے ردی مادوں سے تیار کیا جاتا ہے، پھر بازار میں اصلی کہہ کر فروخت کیا جاتا ہے۔

اسی طرح بدعت کا موجد بھی کوئی ایسی چیز نہیں لاتا جسے لوگ دیکھتے ہی تاڑ جائیں بلکہ وہ بڑی چابکدستی کے ساتھ ملمع سازی کرتا ہے اور اسے ہو بہو شریعت کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ یا پھر بالکل ہی غلط ڈھنگ سے اسے شرعی اصول وضوابط سے ہم آہنگ بنا کر پیش کرتا ہے۔

کیا آپ مشرکین کی طرف نہیں دیکھتے کہ انھوں نے کیا کہہ کے بت پرستی کو رواج دیا۔انھوں نے یہی باور کرایا کہ یہ بت اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے وسیلے ہیں۔

اور جب خانہ کعبہ کا برہنہ طواف شروع کیا تو یہ دلیل گھڑ لی کہ وہ ان کپڑوں میں کیسے طواف کریں جن کو پہن کر انھوں نے اللہ کی نافرمانیاں کی ہیں۔

اگر چہ بدعت اسلام کی جملہ تعلیمات میں سرایت کر سکتی ہے مگر اس کی سب سے بڑی جولان گاہ عبادات ہوتی ہیں۔

اسلام ثابت شدہ نصوص کی روشنی میں عقائد عبادات، اخلاق، سیاسیات اور شخصی،سول اور تعزیری قوانین کا ایک مجموعہ ہے۔

جب کوئی شخص اللہ کا زیادہ سے زیادہ تقرب حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ سب سے پہلے معروف عبادتوں ہی میں زیادتی اور تکلف کرتا ہے۔

مگر کبھی کبھی وہ اسلام کی دیگر تعلیمات کو بھی تختۂ مشق بناتا ہے اور پھر گھسی پٹی عادات یا قوانین کو دین کے روپ میں پیش کرتا ہے جبکہ ان کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی

بلکہ وہ صرف اس کی خواہشات پر مبنی ہوتی ہیں۔

اس طرح بدعت عادات اور عبادات دونوں میں پہنچ جاتی ہے۔

لیکن عادات میں جدت طرازی اگر وہ دین کے رنگ میں نہ ہو اور نہ ہی اس سے کوئی دینی مقصد ہو تو وہ بدعت نہیں ہے بلکہ باریک بینی سے اسے ان شرعی قوانین کی روشنی میں دیکھا جائے گا جن کا مقصد مفاد عامہ کا حصول ہوتا ہے۔ بشرطیکہ وہ مذکورہ بالا دائرہ کار کے اندر اندر ہو۔

لیکن جہاں تک عبادات کا تعلق ہے تو اس میں اتباع محض اصل ہے اور کسی بھی قسم کے اختراع کو بدعت کے جراثیم سمجھتے ہوئے ضلالت و گمراہی قرار دیا گیا ہے۔

یہاں پر آپ سوال کر سکتے ہیں کہ عادات میں جدت پسندی اور عبادات میں جدت پسندی میں کیا فرق ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ عبادت کا طریقہ اور اس کی شکل وصورت ہر چیز شریعت نے متعین کر دی ہے۔ جس میں نئی صورت آمیزی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

لیکن دنیاوی امور میں شریعت نے اس قسم کی کوئی متعین صورت گری نہیں کی ہے جنھیں دنیاوی مقاصد کے حصول کے لیے بروئے کار لایا جاتا ہے۔

لہٰذا مقررہ نمازوں میں مزید کسی نماز کا اضافہ یا متعین رکعتوں میں کوئی زیادتی ہرگز ہرگز قابل قبول نہیں ہوگی۔

جب اسلام نے طہارت کا حکم نافذ کیا تو لوگوں نے دھیرے دھیرے گندے پانی کی نالیوں کو زیر زمین بنالیا اور پائپ وغیرہ کا استعمال کر کے پانی کے نظام کو بہتر بنایا۔ اپنے گھروں کے علاوہ یہی کام انھوں نے مسجدوں میں بھی کیا جبکہ ہمارے اسلاف نے یہ سب نہیں کیا تھا۔ مگر ان سب کاموں کو مذموم بدعت نہیں کہا جاسکتا۔

کیونکہ ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ دنیاوی امور سے بدعت کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے کہ انسانی معاشرہ تغیر پذیر اور ترقی پذیر ہوتا ہے لہٰذا ان چیزوں میں ایجاد واختراع معصیت نہیں ہے۔

معصیت تو کسی نص کی مخالفت یا قاعدہ واصول کو معطل کرنے میں ہے خاص طور سے اس وقت جبکہ یہ نص اور اصول بدستور واجب العمل ہوں اور شریعت کے

احکام میں بہت ہی واضح ہوں۔

بدعت اس نص اور اصول دونوں میں رخنہ انداز ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ انسان کو خطاب الٰہی کی بلند و بالا حقیقت سے نکال کر اس میں نفسانی میلانات کی آمیزش کر کے اسے صراط مستقیم سے ہٹا دیتی ہے۔

گنہگار شخص اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ جانتا ہے کہ اللہ نے کیا حکم دیا ہے اور کبھی کبھی دیر سویر توبہ بھی کر لیتا ہے۔

مگر بدعتی شخص کے تو ذہن ہی میں دین کا غلط مفہوم بیٹھا ہوتا ہے۔ وہ غیر مشروع طریقہ اختیار کر کے خدا کا تقرب حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس کے لیے ایسے وسائل اختیار کرتا ہے جنھیں نہ تو اللہ نے فرض کیا ہوتا ہے اور نہ ہی ان کی اجازت دیتا ہے۔

کبھی کبھی معصیت بھی بدعت بن جاتی ہے اگر اسے دین بنا دیا جائے۔

قرآن کے ذریعہ کھانا کمانا حرام ہے کیونکہ حضورؐ کا فرمان ہے ''لا تاکلوا بہ'' یعنی اس سے نہ کھاؤ۔

اب اگر اسے دین بنا لیا جائے اور اجرت دیکر محض ثواب کی خاطر حفاظ قرآن کو جنازے کے پیچھے پیچھے چلنے کے لیے بلایا جائے تو پھر اس میں تو دوگنا گناہ ہے ایک معصیت کا دوسرا بدعت کا۔

☆☆☆

کچھ علماء کی رائے یہ ہے کہ حضورؐ کے بعد ہر وہ چیز جو دین کی مخالف ہو یا مخترع ہو وہ بدعت ہے۔

ان میں وہ معاصی بھی شامل ہیں جن سے شریعت نے منع کیا ہے یا وہ جدت طرازیاں بھی شامل ہیں، جنھیں جاہلوں یا غرض پسندوں نے دین کا رنگ دے کے پیش کیا ہے جبکہ ان کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

مگر یہ تعریف حقیقت واقعہ سے دور ہے۔

اور اس سے بھی دور وہ لوگ ہیں جو بدعت میں ان تمام اشیاء کو سمیٹ لیتے ہیں جو حضورؐ کے بعد رونما ہوئی ہیں، خواہ وہ عادات ہوں یا عبادات ہوں، خیر ہوں یا

شر ہوں، قابل تعریف ہوں یا قابل مذمت۔

پہلی تعریف کو امام شاطبیؒ نے اختیار کیا ہے اور اسی کی روشنی میں اپنی کتاب ''الاعتصام'' میں مذموم بدعات کا تذکرہ کیا ہے۔

اللہ کے دین یا لوگوں کی دنیا میں ہر نئی چیز کو بدعت کا نام دینا شاید اس کے لفظی معنی کی وجہ سے کیا گیا ہو نہ کہ اس کی معروف ومشہور شرعی اصطلاح کی وجہ سے۔

اس تعریف کو قرافیؒ اور عزالدینؒ بن عبدالسلام نے اختیار کیا ہے، لیکن یہ تعریف صحیح نہیں ہے گو کہ انجام کار بات وہیں تک پہنچتی ہے کہ اسلام میں تمام مذموم اضافوں سے انکار کیا جائے۔

کیونکہ علماء کے درمیان اس بارے میں تو کوئی اختلاف ہی نہیں ہے، ہاں، لفظ بدعت کے مدلولات کے تعین میں ضرور اختلاف ہے۔

بدعت اور مصلحت عامہ

استاذ شیخ عبدالوہاب خلاف نے اپنی کتاب ''علم اصول الفقہ'' میں لکھا ہے، ''جو شخص بھی قرآن میں مذکور احکام کی آیتوں پر غور کرے گا وہ یہ دیکھے گا کہ عبادات اور اس سے متعلق شخصی احوال جیسے میراث وغیرہ میں اس کے احکامات تفصیلی ہیں۔

کیونکہ اس نوعیت کے تمام تر احکام خالص تعبدی ہیں اور انھیں ماحول کی تبدیلی کے مطابق ڈھالا نہیں جا سکتا۔

لیکن عبادات اور احوال شخصی کے علاوہ وہ شہری، تعزیری، دستوری اور ملکی احکام عام قواعد اور بنیادی مبادیات پر مبنی ہیں جن میں جزئی تفصیلات سے شاذ و نادر ہی تعرض کیا گیا ہے کیونکہ یہ احکامات ظروف ومصالح کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔

چنانچہ مذکورہ بالا امور کے لیے قرآن نے صرف بنیادی اصول وضوابط بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے تاکہ ہر زمانہ میں ارباب حل وعقد اپنے قوانین کو وقتی مصالح کے مطابق قرآن کے مقرر کردہ اصول وضوابط کی روشنی میں ڈھال لیں اور وہ بھی کسی جزئی حکم سے متصادم ہوئے بغیر''۔

نجم الدین الطوفی رقم طراز ہیں:

''ہم نے معاملات وغیرہ میں مفاد و مصلحت کو قابل اعتبار سمجھا ہے عبادات میں نہیں کیونکہ عبادات تو خالص شارع کا حق ہیں اور جملہ حقوق اسی کے حق میں محفوظ ہیں۔

اور اس کے حق کی معرفت خواہ وہ کمیت کے اعتبار سے ہو یا کیفیت، زمان و مکان کے اعتبار سے ہو صرف اسی کے ذریعہ ہو سکتی ہے، اس لیے بندہ تو اس متعین کردہ خطوط ہی پر چلے گا۔

کیونکہ ایک غلام اسی وقت اطاعت گذار غلام کہلاتا ہے جب وہ اپنے آقا کا حکم من وعن مانے اور وہی کام کرے جس سے اس کا آقا خوش ہو۔

یہی حال یہاں بھی ہے۔ اسی لیے جب فلسفیوں نے اپنی عقل کا استعمال کیا اور شریعت کا انکار کیا تو انھوں نے رب العزت کو ناراض کیا، خود بھی گمراہ ہو گئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔

اس کے برخلاف جہاں تک بندوں کے حقوق کا سوال ہے تو یہ سیاسی اور شرعی احکامات ہیں جنھیں بندوں کی مصلحت کی خاطر وضع کیا گیا ہے اور انھیں مصالح کو مدنظر رکھا جائے گا اور انھیں عام مصالح کے حصول کے مطابق ڈھالا جائے گا۔

اس کے بارے میں امام عزالدین بن عبدالسلام مصریؒ شافعی کا یہ قول بھی سنتے چلیے۔

''جو شخص مصالح کے حصول اور مفاسد کے دفع کے لیے شرعی مقاصد پر غور کرے گا اسے یہ معلوم ہو جائے گا کہ اس مصلحت کو چھوڑا نہیں جا سکتا اور فساد کو باقی نہیں رکھا جا سکتا۔

''خواہ اس کے لیے کوئی نص، اجماع یا قیاس بھی نہ ہو''۔

''کیوں کہ شریعت کی فہم اسے لازمی قرار دیتی ہے''۔

☆☆☆

مذکورہ بالا اقوال سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ عبادات کے سلسلہ میں شریعت کا موقف عادات و معاملات سے قطعی جداگانہ ہے۔

پہلی صورت میں تو شریعت نے حقیقت، صورت، زمان، مکان، کمیت،

کیفیت، اجمال اور تفصیل سب کو اس طرح متعین کر دیا ہے کہ ان میں اجتہاد یا زیادتی وکمی کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہی۔ ہمارے ذمہ تو ان کو بعینہ قبول کر لینا ہے اور کچھ بھی نہیں۔

لہٰذا جہاں تک عبادات کا تعلق ہے تو وہ صاحب رسالت کے زمانہ سے لے کر رہتی دنیا تک ایک ہی نہج پر چلنی چاہئیں۔ اول اور آخر میں ذرا بھی فرق نہ ہو، پوری پوری ہم آہنگی کے ساتھ اول سے آخر تک۔

لیکن دوسرے قوانین عام مصلحت کے تابع ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں وارد تمام نصوص اور اصول وضوابط کے واحد محور ان مقاصد کے حصول کے علاوہ ہر جنس اور ہر نسل کے لیے قوانین بدلتے رہیں گے۔

کبھی کبھی ایک مصلحت کے لیے مختلف ذرائع موجود ہوتے ہیں اور یہ تمام ذرائع مشروع اور جائز ہو سکتے ہیں۔

چونکہ تمام معاملات معقول مصلحتوں پر مبنی ہوتے ہیں، اس لیے ان کے اصول وفروع کے سلسلہ میں وارد نصوص سے صرف نظر نہیں کر سکتے۔

یہ نصوص تو زمین میں قائم مختلف نوعیت کے ستون ہیں جن کے سہارے آپ اپنی من پسند عمارت کھڑی کر سکتے ہیں، بشرطیکہ یہ عمارت پوری طرح ان پر قائم ہو اور ان سے ذرا بھی تجاوز نہ کرے۔

☆☆☆

جہاں تک معاملات کا تعلق ہے تو اس سے متعلق فقہی مسائل کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ اس میں نص کے ساتھ ساتھ عقل کو بھی اپنی جولانی دکھانے کی اجازت ہے۔ کچھ لوگوں نے عبادات کے دائرہ کو بھی وسیع کرنے کا مسلک اختیار کیا ہے جو سراسر غلط ہے۔

عبادات کی بنیاد جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں اتباع محض پر رکھی گئی ہے۔

جبکہ عبادات کے علاوہ ایسی بات نہیں ہے۔

عبادات کے علاوہ دیگر چیزوں کو آپ بدعت کہہ کے اس کی تعریف یا مذمت نہیں کر سکتے۔

پانچ بنیادی چیزوں کی ضمانت تو آسمانی شریعتوں اور زمینی قوانین دونوں نے مشترکہ طور سے دی ہے۔

اگرچہ اس معاملہ میں اللہ کی ہدایت زیادہ محکم اور محفوظ ہے۔

یہ پانچ بنیادی چیزیں ہیں، دین، جان، عزت وآبرو، عقل اور مال۔

ان کی حفاظت کی ضمانت کے لیے بے شمار دلیلیں ہیں جن کے ذکر کی یہاں چنداں ضرورت نہیں ہے۔

اور اگر ان پانچوں چیزوں کے تحفظ کی دلیل نہ ہو تب بھی شارع ان پانچوں یا ان میں سے کسی بھی ایک کی حمایت کی دلیل کا احترام کرے گا اور اسے ضروری اہمیت دے گا۔

قرآن شریف کو ایک مصحف کے اندر جمع کرنے کا مسئلہ ہی لے لیجئے اس سلسلہ میں اگرچہ کوئی حکم وارد نہیں ہوا ہے لیکن یہ تو شریعت کی حفاظت اور دین کے قیام کا مسئلہ ہے۔

اسی طرح عقائد کی تشریح اور ملحدوں کی تردید کے لیے کتابوں کی تصنیف کا کام ہے۔

اس نوعیت کے کام تو اسلام کے عین مقاصد میں سے ہیں بلکہ یہ تو عقل سلیم کا تقاضا بھی ہے خواہ اس کے لیے دین میں کوئی تشریح موجود نہ ہو۔ انہی چیزوں کو کچھ حضرات نے عام مصالح کا نام دیا ہے۔

اس قسم کے مصالح جیسا کہ آپ نے دیکھا لوگوں کی زندگی اور ان کی آخرت کے بارے میں بہتر سوچ کی پیداوار ہیں۔

درحقیقت جو لوگ ان چیزوں کو بدعت حسنہ یا بدعت واجبہ کا نام دیتے ہیں، وہ غلطی پر ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان چیزوں کا عہد رسالت میں نہ ہونا اسے اختراع کے ضمن میں لے آئے گا جبکہ یہ عقلی تقاضے اور خیر کے مظہر ہونے کی وجہ سے مذموم بدعت کے دائرہ کار میں آتے ہی نہیں ہیں۔

یہ درحقیقت قابل مذمت بدعت کے مفہوم سے ذہول نیز عبادات ومعاملات کو باہم مخلوط کر دینے کا نتیجہ ہے۔

بدعت تو عبادات میں جدت کو کہتے ہیں جس میں اجتہاد یا اپنی رائے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔

ہاں، عام مصالح اور معاملات کے میدان میں عقل وفکر کو اپنی جولانیاں دکھانے کی اجازت ہوتی ہے۔

پھر بدعت تو جہلاء خود اپنے لیے ایجاد کرتے ہیں، تاکہ وہ یہ طریقہ اپنا کر بزعم خود اللہ کا تقرب حاصل کرسکیں۔

رہا عام مصالح کا سوال تو وہ ان وسائل کا نام ہے جنھیں اختیار کر کے جمہور امت کے عام حقوق کی حفاظت کی جاتی ہے۔

اس لیے ہر جدت طرازی کو آپ بدعت کے دائرہ کار میں داخل کر کے اسے قابل مذمت قرار نہیں دے سکتے۔

اسی زمرہ میں وہ اعمال بھی آتے ہیں جنھیں مفاد عامہ کے پیش نظر کتاب و سنت نے جائز قرار دیا ہے۔

اور وہ تمام مختلف قسم کے اعمال بھی آتے ہیں جو کسی عمومی حکم کے ضمن میں آتے ہیں لیکن کسی صحیح حدیث کے ذریعہ اس کی صورت گری نہ کی گئی ہو۔ اللہ رب العزت فرماتا ہے:

وافعلو الخیر لعلکم تفلحون ﴿الحج:۷۷﴾ — تم نیکی کرو تاکہ کامیاب ہو جاؤ۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے:

وتعاونوا علی البر والتقوی. ﴿المائدہ:۲﴾ — نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو۔

لہٰذا نیکی اور اس میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون جیسے احکام میں آپ نئی نئی راہیں نکالیے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وقاتلوا فی سبیل الله واعلموا ان الله سمیع علیم ﴿البقرة:٢٤٤﴾ — اللہ کے راستے میں جنگ کرو اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

لہٰذا قتال کی کیفیت، اس کے وسائل اور اس کے میدان وغیرہ بے شمار ہیں جن کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔

ان سب چیزوں میں جدت طرازی کا تعلق اس مذموم بدعت سے ہرگز نہیں ہے جس میں آنکھ بند کر کے حکم الٰہی کا اتباع کرنا ہوتا ہے نہ اس سے زیادہ نہ کم۔

☆☆☆

ہاں آپ مذکورہ بالا عام نصوص کا دائرہ کار اتنا وسیع نہیں کر سکتے کہ ان میں وہ عبادات بھی آ جائیں جن کی صورت، کمیت وکیفیت کو حضورؐ نے متعین کر دیا ہو۔

چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

یا ایھا الذین آمنوا اذکرو الله ذکرا کثیرا وسبحوہ بکرۃ واصیلا	اے ایمان والو! اللہ کا زیادہ سے زیادہ ذکر کرو اور صبح وشام اس کی تسبیح بیان کرو۔

﴿الاحزاب:۴۲﴾

تو یہاں پر ذکر کی کثرت اور تسبیح پر دوام کسی شخص کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ نماز میں کسی رکعت کا اضافہ کر دے یا وہ عید میں اذان دینا شروع کر دے یا وہ کوئی وظیفہ مرتب کر کے لوگوں پر اس کا پڑھنا لازمی قرار دے دے۔ یا اسی طرح کی اور چیزیں لوگوں کے سامنے پیش کرے۔

کیونکہ ان عبادات کو باقاعدہ سانچے میں ڈھال کے امت کو عطا فرمایا گیا ہے اور کسی بھی شخص کو خواہ وہ کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو اس میں کمی بیشی کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔

لیکن معاملات کے بارے میں ایسی بات نہیں ہے۔ مال کی حفاظت، حقوق کی نگہداشت اور مفادات کے حصول کے لیے ممکنہ تدبیر شریعت کے اولین مقاصد میں سے ہیں۔

چنانچہ اگر حاکم یہ محسوس کرتا ہے کہ امن و امان برقرار رکھنے کے لیے کچھ تاوان عائد کرنا ضروری ہے یا کچھ ایسی ضمانتیں درکار ہیں، جن کی ضرورت عہد نبوی میں نہیں پیش آتی تھی تو اس کے لیے ایسے اقدامات کرنا ضروری ہے اور ان کو بدعت نہیں کہا جا سکتا۔

اسی مفاد عامہ کے پیش نظر اگر کوئی صنعت وحرفت والا مرمت کے وقت لوگوں کا مال ضائع کردے تو اس کو تاوان دینا پڑے گا اور اسی لیے ایک شخص کے قتل میں ملوث تمام لوگوں کو قصاص میں قتل کیا جائے گا خواہ ان کی تعداد سیکڑوں میں ہی کیوں نہ ہو۔

اسی زمرے میں قید و بند کی سزا بھی آتی ہے۔ ان تمام چیزوں میں صحابہؓ اور تابعینؒ نے بغیر کسی نکیر واعتراض کے اقدامات کیے تھے۔

انہی سب چیزوں کو کچھ لوگوں نے مفاد عامہ کا نام دیا ہے جیسا کہ ہم نے مذکورہ بالا سطور میں ذکر کیا تھا۔

لیکن ہمیں نام سے کوئی سروکار نہیں ہے، ہمیں تو موضوع سے مطلب ہے۔

اس لیے علماء کا اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ دین کے عام مقاصد ہیں، جن کے لیے مختلف نصوص وہدایات ہیں۔

اور ان مقاصد کے حصول کی خاطر نت نئے اور مختلف النوع وسائل کو بروئے کار لانا چاہیے۔

بشرطیکہ ان وسائل کا مقصد ان مقاصد کا حصول ہو جس کے لیے مختلف ذرائع اختیار کیے جاسکتے ہیں۔ ہم کسی ایک چیز کو پکڑ کر بیٹھے رہنے کے مکلف نہیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے عدل واحسان کا حکم دیا ہے اور قریبی رشتہ داروں کی خبر گیری کرنے کا۔ اسی طرح سے فواحش، منکرات اور ظلم وجور سے بچنے کا حکم دیا ہے۔

اب اول الذکر چیزوں کے حصول اور آخر الذکر چیزوں سے اجتناب کے لیے آپ جو بھی چاہیں راہ اختیار کر سکتے ہیں، زمان ومکان کے تقاضے کے مطابق ان کے لیے نئے وسائل کے اختیار کو آپ بدعت نہیں کہہ سکتے۔

اسی طرح قضا کے نظام میں دعویٰ پیش کرنے اور سماج کے حقوق کی نگہداشت کے لیے پبلک پراسیکیوٹر کا آفس بھی قائم کر سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ موجودہ دور کے مطابق ہم عدالتوں کے نظام کو بھی قائم کر سکتے ہیں، اگر چہ دور اول میں اس طرح کا نظام موجود نہیں تھا۔

اسی طرح لوگوں کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے ضمانتوں کا طلب کرنا

بھی بدعت کے دائرہ کار میں داخل نہیں ہوسکتا۔

مذکورہ بالا باتوں سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ بدعت کا دائرہ کار تو صرف عبادات تک ہی محدود ہے جہاں پر غور وفکر یا اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔

لیکن معاملات کے سلسلہ میں شریعت نے ایسی کوئی حد بندی نہیں کی ہے۔ اس لیے خیر وفلاح کے کاموں میں نئے نئے وسائل کی تلاش اور پھر ان کا استعمال دراصل اس مشہور ومعروف قاعدہ کے ضمن میں آجاتا ہے کہ جو چیزیں واجب کی ادائیگی کے لیے ناگزیر ہوتی ہیں وہ بھی واجب بن جاتی ہیں۔

اتباع کی حدیں

جب ہم شارع کی دی ہوئی چیزوں کے التزام پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ہمارے لیے یہ لازم ہے کہ ہم ان چیزوں کو نہ چھوڑیں جن کو انھوں نے کیا ہے اور ان چیزوں کو چھوڑ دیں جن کو انھوں نے چھوڑ دیا ہے۔

اس لیے سنت میں مثبت اور منفی دونوں پہلو ہوتے ہیں، یعنی ایک سنت کرنے کی ہے اور دوسری چھوڑنے کی۔

مذموم بدعت یہ ہے کہ شریعت میں وارد شے میں ہم کوئی نیا اضافہ کردیں یا کسی خلاء کو جو جان بوجھ کر چھوڑا گیا ہو ہم بھر دیں۔ یعنی جہاں پر شریعت نے سکوت اختیار کیا تھا ہم اپنی طرف سے میدان میں متحرک ہو جائیں۔

اسلام نہ یہ ہے اور نہ وہ ہے۔ جسے شریعت نے ترک کردیا ہو اس کا کرنے والا بالکل اسی طرح ہے جیسے سنت کو چھوڑنے والا۔

ہم نے ابھی ابھی بتایا ہے کہ نئے نئے وسائل فطری طور سے اس زمرے میں نہیں آتے۔ توپوں سے لڑائی بدعت نہیں ہے اور نہ اسے آپ ایسا فعل قرار دے سکتے ہیں، جسے حضورؐ نے ترک کیا ہو۔ بلکہ یہ ''واجب کے لوازمات'' کے زمرہ میں داخل ہے۔

ہم تو ثابت مقاصد اور معین عبادات کی بات کر رہے ہیں۔

جسے حضورؐ نے مساعد حالات ہونے اور کوئی رکاوٹ نہ ہونے کے باوجود

چھوڑا ہو تو اس کا چھوڑنا سنت اور کرنا بدعت ہے۔

آج کل مسلمان کسی عزیز و رشتہ دار کی وفات کے موقع پر جمع ہوتے ہیں اور قرآن خوانی کرتے ہیں اور کراتے ہیں۔ اس مجلس میں شربت وغیرہ کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے اور لوگ تعزیت بھی کرتے ہیں۔

ہمارے اسلاف میں ثواب کی نیت اور رحمت کی طلب دونوں باتیں موجود تھیں۔ اس کے باوجود کسی بھی جلیل القدر صحابیؓ کی وفات پر ایسا نہیں کیا گیا جبکہ بے شمار صحابیؓ فوت ہوئے اور اس موقع پر وہ بھی طلب رحمت کر سکتے تھے اور پھر قرآن خوانی کرانے میں کوئی رکاوٹ بھی حائل نہیں تھی۔

آج کل کا یہ رواج بلاشبہ بدعت ہے کیونکہ شریعت نے اس کی مطلق اجازت نہیں دی تھی اور پھر مقتضی ہونے اور رکاوٹ نہ ہونے کے باوجود اس کو نہیں کیا۔

کیا ہم اسے اللہ کی رضا حاصل کرنے اور متوفین کے لیے اللہ کی رحمت طلب کرنے میں کوتاہی پر محمول کریں۔ ایسا کرنا تو صاحبؐ رسالت اور ان کے قریبی اصحابؓ کے بارے میں بڑی بدگمانی ہوگی۔ ہم اس طرح کی باتیں نہ سوچ سکتے ہیں اور نہ ہی ان کا تصور کر سکتے ہیں۔

یہاں پر آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے رمضان کی تراویح کے لیے لوگوں کو ایک قاری کے پیچھے جمع کیا تھا جبکہ حضورؐ کے زمانہ میں ایسا نہیں ہوا تھا بلکہ یہ بات ثابت ہے کہ جب حضورؐ نے دیکھا کہ صحابہ ان کے پیچھے آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں تو آپ مسجد میں تشریف نہیں لائے اور پھر تنہا نماز ادا کی۔

یہ بات صحیح ہے، لیکن حضرت عمرؓ کے عمل میں راز کی بات یہ ہے کہ اب وہ خوف جاتا رہا جس کی وجہ سے عہد رسالت میں لوگ تنہا تنہا تراویح پڑھتے تھے۔

حضورؐ نے جب یہ دیکھا کہ صحابہؓ کرام تراویح اور تہجد کی نماز ان کے پیچھے پڑھنا چاہتے ہیں تو آپ کو یہ خوف لاحق ہوا کہ کہیں یہ نمازیں امت پر فرض نہ کر دی جائیں اور پھر یہ امت اس فرض کو ادا نہ کر سکے۔

حضورؐ کی وفات کے بعد جب وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا اور مانع جاتا رہا تو حضرت عمرؓ نے نماز تراویح کے لیے جماعت قائم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا۔

پھر حضرت عمرؓ خلفاء راشدین میں سے تھے۔ حضورؐ کی ہدایت کے مطابق لوگ ان کی اتباع کرتے تھے۔ وہ مقدمات کا فیصلہ کرتے تھے۔ ان کی سنت تو اسلام کی ہدایت کا ایک جز ہوگی۔ کیا ان کی اتباع رسولؐ خدا کی اتباع نہیں ہوگی؟ کیا ان کی اطاعت امر نبوی کے خلاف ہوگی؟

جن باتوں کو حضورؐ نے محرکات واسباب کے وجود اور مانع نہ ہونے کے باوجود ترک کیا ہو، اس کا کرنا صحیح دین نہیں ہوسکتا اور نہ ہی سیدھا راستہ ہوسکتا ہے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو آپؐ اسے ترک ہی کیوں فرماتے۔

لیکن جن باتوں کو آپ نے اسباب ومحرکات نہ ہونے کی وجہ سے چھوڑا ہے وگرنہ عام ضابطہ کے تحت اگر اسباب موجود ہوتے تو آپ انھیں کرتے تو یہ اعمال بدعت کیسے ہوسکتے ہیں۔ بلکہ ان کا انجام دینا اسلامی اصول کے عین مطابق ہوگا۔

مثال کے طور پر حضورؐ نے عبادات کی ادائیگی کے وقت زبان سے نیت کو ترک فرمایا تھا لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ ترک نیت سنت ہے اور کرنا بدعت ہے۔

یہ بات اور ہے کہ حضورؐ نے قیاس اور منطقی مسائل کو وہ فنی شکل نہیں دی جیسے ارسطو وغیرہ نے اپنے دعاوی کے لیے دی تھی۔

لیکن بعد میں ماحول کی ترقی اور فلسفہ کے عام ہو جانے کی بعد اگر ہم اسے فلسفہ کی شکل میں پیش کریں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ یہ تو مناسب ڈھنگ سے دین کا دفاع کرنا ہوا۔

آپ کے مخاطب امی لوگ تھے، اولین اہل کتاب نہیں، آزاد فلسفی عقل پسند لوگ نہیں۔

دراصل اسلامی تعلیمات کے بارے میں ہم ان ممنوعات سے ڈرتے ہیں، جنھیں آج کل لوگ کرنے لگے ہیں، اس حقیقت کے باوجود کہ انھیں حضورؐ نے جان بوجھ کر چھوڑ دیا تھا یا ان کی طرف سے اعراض برتا تھا اور جن کے بارے میں صحابہ کرامؓ نے بھی سکوت فرمایا تھا۔ اگر ان میں کوئی چیز ہوتی یا ان کے ذریعہ اللہ کی قربت حاصل کی جاتی تو وہ یہ کام بدرجہ بہتر انجام دیتے۔

انصاف کی بات تو یہ ہے کہ جن باتوں کو حضورؐ نے ترک فرمایا تھا ان کو کرنے

کے لیے اس قدر سرگرمی سرکشی اور صراط مستقیم سے صریح انحراف ہے۔

تو جو لوگ ذکر کی مجلسوں میں عالم وجد میں آ کے رقص کرنے لگتے ہیں وہ یہ کام اگر فٹ بال کے میچ میں کرتے تو شاید یہ بات ان کی دنیا کے لیے اور دین کے لیے بھی زیادہ بہتر ہوتی۔

پھر ہم وہ کام کرتے ہی کیوں ہیں جس سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں معافی دے دی ہے۔ یا ہم کیوں اس کام کے پیچھے پڑیں جس سے اس نے سکوت کیا ہے۔

حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے، ''اللہ تعالیٰ نے فرائض فرض کیے ہیں انھیں ضائع نہ کرو، حدود متعین کیے ہیں ان سے تجاوز نہ کرو اور کچھ چیزوں سے تمہارے اوپر رحم کرتے ہوئے بھول چوک کے بغیر سکوت اختیار کیا ہے ان کے پیچھے نہ پڑو۔

علامہ ابن قیمؒ نے اعلام الموقعین میں لکھا ہے:

''حضورؐ کی ترک عمل کے بارے میں منقولات کی دو قسمیں ہیں اور دونوں سنت ہیں۔

اول یہ کہ حضورؐ نے اس طرح ترک فرمایا کہ پھر کبھی نہ کیا ہو جیسے شہداء احد کا غسل اور نماز جنازہ، عید کی نماز میں اذان و اقامت اور دو نمازوں کو جمع کرنے کے درمیان تسبیح پڑھنا۔

دوم: اس عمل کو نقل نہیں کیا کیونکہ اگر آپؐ نے کیا ہوتا تو اس کے تمام محرکات اور اسباب یا کوئی ایک سبب یا محرک موجود ہوتا۔

مگر چونکہ اسے کسی نے نقل نہیں کیا اور نہ ہی کسی مجمع میں کبھی اس کا ذکر کیا تو اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ آپ نے اسے کیا ہی نہیں۔ جیسے نماز کا ارادہ کرتے وقت نیت کے الفاظ ترک کرنا، اسی طرح نماز کے بعد مقتدیوں کی طرف منہ کر کے فجر اور عصر کی نماز میں دعا مانگنا اور پھر مقتدیوں کا اس دعا پر آمین کہنا یا پھر تمام نمازوں میں دعا مانگنا اور مقتدیوں کا اس پر آمین کہنا وغیرہ وغیرہ۔

اس کے بعد علامہ ابن قیمؒ نے اس پر اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مذکورہ بالا باتوں کا کرنا بھی سنت ہے اور ترک کرنا بھی سنت ہے۔

اس طرح ہم اسے ترک بھی کر سکتے ہیں اور اس پر عمل بھی کر سکتے ہیں۔ اس

میں کوئی فرق نہیں ہے۔

علامہ شاطبیؒ نے اس نظریہ کی تائید کرتے ہوئے اپنی کتاب ''الاعتصام'' میں لکھا ہے کہ:

''کچھ لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ جن باتوں میں شارعؑ نے سکوت فرمایا ہے کیا ہمارے لیے اس پر عمل یا ترک دونوں جائز نہیں ہیں؟''

علامہ شاطبیؒ نے اس سوال کا جواب یہ دیا ہے:

''اس مسئلہ کی اصل یہ ہے کہ جن چیزوں سے شارع نے سکوت فرمایا ہے یا کسی وجہ سے اسے ترک کیا ہے اس کی دو قسمیں ہیں۔

پہلی قسم یہ کہ شریعت نے اس سے سکوت اس وجہ سے کیا ہے کہ اس کا کوئی محرک موجود نہیں تھا جیسے کہ حضورؐ کی وفات کے بعد حوادثات و آفات کا ظہور۔ آپؐ کے زمانہ میں ان کا ظہور نہیں ہوا تھا جس کی وجہ سے آپؐ نے سکوت فرمایا۔ اہل شریعت نے ان تمام امور پر غور و خوض کیا اور پھر دین کے وضع کردہ کلیات کی روشنی میں ان پر عمل کیا۔

اس قسم میں وہ تمام مسائل داخل ہیں جن پر ہمارے اسلاف نے غور و خوض کرنے کے بعد فیصلہ کیا، جیسے صنعت و حرفت والوں کی طرف سے سامان تلف ہو جانے کی ضمانت، بھائیوں کے ساتھ دادا کی بھی وراثت، فرائض کی ذمہ داری، قرآن شریف کو جمع کرنا اور شریعت کو مدون کرنا۔ ان سب باتوں کی حضورؐ کے زمانہ میں کوئی ضرورت نہیں پڑی تھی۔

اس قسم میں جب کسی سبب کا ظہور ہوتا ہے تو مجتہدین اس پر غور و خوض کرتے ہیں کیونکہ اس سے سکوت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اسے ترک کرنا جائز ہے۔

دوسری قسم یہ ہے کہ شارع کسی خاص حکم سے سکوت اختیار کرتا ہے یا اسے ترک کر دیتا ہے جبکہ اسے کرنے کا داعیہ بھی موجود تھا اور وحی کے نزول کے زمانہ میں اس کا سبب بھی موجود تھا مگر اس کے باوجود شارع نے اس سلسلہ میں کوئی حکم نہیں دیا۔

''یہی دوسری قسم بلا شبہ قابل مذمت بدعت ہے''۔

اس کے بعد علامہ شاطبیؒ مزید لکھتے ہیں:

"یہ بدعت اس وجہ سے ہے کہ شارع نے داعیہ ہونے کے باوجود اس پر سکوت فرمایا۔ ایسی صورت میں امت کا اجماع ہے کہ صورت حال کو جوں کی توں باقی رکھا جائے بغیر کسی زیادتی کے۔

کیونکہ اگر وہ اسے قابل عمل سمجھتے تو ضرور کرتے۔ وہ اس کا شعور ہم سے کہیں زیادہ رکھتے تھے اور عمل میں سبقت کے بھی طلب گار رہتے تھے۔

یہی فقہاء امت کی رائے ہے اور تمام امت کے لیے اسے لازم پکڑ لینا اور حدود پر قائم رہنا ضروری ہے"

بدعت ایک حقیقی ہوتی ہے اور دوسری اضافی۔

بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ بدعت شریعت کے متوازی اور مقابل ہے جس کی وجہ غلو اور باطل چیز کا اضافہ کرنا ہے۔ اور چونکہ اس فریب کے آثار میں بہت زیادہ فرق ہوتا ہے اس لیے بدعت کی بھی مختلف قسمیں ہوتی ہیں۔

لہٰذا جو صورت و موضوع دونوں اعتبار سے دین کی مخالف ہو اور اس کے واضح راستوں سے کوسوں دور ہو وہ اس سے مختلف ہے جو اس کی کسی تعلیمات سے کچھ تعلق رکھتی ہو۔

حقیقی اور اضافی بدعات

اسی لیے علماء نے بدعت کو حقیقی اور اضافی دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔

مردوں کی قبروں کا طواف خانہ کعبہ کے طواف کی نقل ہے بلا شبہ بدعت حقیقی ہے۔

شریعت نے مردوں کی زیارت کا حکم دیا ہے تاکہ لوگوں کو اپنا انجام نظر آئے اور دنیاوی زندگی کی دل فریبیوں میں نہ آئیں۔

لیکن قبروں کو اونچا کرنا، ان پر قبہ بنانا، ان کی نعشوں کو مقدس ماننا، ان کی زیارت کرنا پھر دو دو، تین تین، چار چار کی جماعتوں میں ان کا طواف کرنا اور وہ بھی اللہ کا تقرب سمجھ کے بلا شبہ حقیقی بدعت ہے۔

اور اگر ان اصحاب قبور سے مناجات کی جائے، انھیں ماوا و ملجا سمجھا جائے، ان

کی طرف سے قبولیت کا انتظار کیا جائے تو یہ بے شک شرک و نافرمانی ہے۔

اسلامی شریعت اور اس کے آداب سے متعلق جو بھی واہیات رسمیں شریعت سے بے خبر جاہل لوگ ایجاد کرتے ہیں انھیں بدعت حقیقی ہی کہا جائے گا جیسے راہبانہ زندگی گذارنا، حلال و پاکیزہ چیزوں سے پرہیز کرنا، اللہ کی عبادت میں خواہ مخواہ کی زیادتی، نص اور قیاس جلی کو چھوڑ کے اپنی ذاتی رائے اور فکر پر عمل کرنا یہ سوچ کر کہ وہ اپنی عقل کے بل بوتے پر بغیر وحی کی مدد کے اللہ کی رضا حاصل کر سکتے ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ بدعت حقیقیہ اس بدعت کو کہتے ہیں جس کی بنیاد کتاب و سنت، اجماع یا مبادیات اسلام پر قائم نہ ہو۔

دراصل بدعات حقیقیہ میں عام لوگ کم ہی مبتلا ہوتے ہیں۔

لیکن بدعات اضافیہ کا معاملہ کچھ اور ہی ہے۔ لوگوں کی بہت بڑی اکثریت ان کا شکار بن جاتی ہے کیونکہ ان کا تعلق مختلف پہلوؤں والی چیزوں سے ہوتا ہے ایک پہلو سے وہی چیزیں سنت ہوتی ہیں جبکہ دوسرے پہلو سے وہ بدعت بن جاتی ہیں۔

ایک پہلو سے ان کی بنیاد نص معین یا پاکیزہ اصول پر ہوتی ہے مگر دوسرے پہلو سے دیکھنے پر اس میں اضافہ اور جدت طرازی کا پہلو صاف نظر آتا ہے۔

مثال کے طور پر نماز ختم ہونے پر تمام علماء اتفاق رائے سے تسبیح، تحمید اور تہلیل کو سنت مانتے ہیں۔ اس میں کسی کا بھی اختلاف نہیں ہے۔

پھر ایک شخص کو ان اذکار کو منظم کرنے کی سوجھی۔ اُس نے اٹھ کے بلند آواز سے الحمدللہ سبحان اللہ اور اللہ اکبر کہنا شروع کیا جس کو دیکھ کر تمام اہل مسجد منظم اور مربوط طور سے یہ پڑھنے لگے۔

اس کے بعد بات یہاں تک بڑھی کہ اس شخص کے ذکر اور دعا کی آواز پوری مسجد میں گونجنے لگی اور بقیہ نمازی اس کو دہراتے تھے اور آمین کہتے تھے اور پھر اپنے گھروں کو لوٹ جاتے تھے۔

لہٰذا ختم نماز پر تسبیح، تحمید اور تہلیل سنت ہے مگر یہ نیا انداز بدعت اضافی ہے۔

اس پر نکیر کرنے والوں کا کہنا ہے کہ حضورؐ سے جو طریقہ ماثور ہے اس پر اکتفا کرنا چاہیے اور کچھ نہیں۔

جبکہ یہ طریقہ اختیار کرنے والوں کا کہنا ہے کہ یہ ایک سنت کی ادائیگی کے لیے مشترکہ تعاون ہے کیونکہ انفرادی طور سے اسے لوگ بھول جاتے ہیں۔

اسی سے ملتی جلتی چیز نماز جمعہ سے قبل سورہ کہف کی تلاوت ہے۔ حضورؐ اور ان کے اصحابؓ کے بارے میں یہ جانا جاتا ہے کہ وہ جمعہ کے فریضہ کے لیے تیزی سے جاتے تھے۔

جب وہ مسجد تک پہنچ جاتے تھے تو مسجد میں خاموشی کے ساتھ داخل ہو کر جہاں چاہے بیٹھ جاتے تھے۔ ان کے سکون اور وقار میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، یہاں تک کہ وہ خطبہ سنتے تھے اور نماز ادا کرتے تھے۔

کوئی ایسا اثر بھی منقول نہیں ہے جو سورہ کہف کو نماز جمعہ کا ایک شعار قرار دیتا ہو جیسا کہ آج کل لوگ کر رہے ہیں۔

صرف چند ضعیف حدیثیں ہیں جو سورہ کہف اور کچھ دوسری سورتوں کو جمعہ یا جمعرات کو پڑھنا بہتر قرار دیتی ہیں۔

حاکم نے حضورؐ سے یہ روایت کی ہے کہ ''جس نے سورہ کہف کو جمعہ کے دن پڑھا اس کے لیے دونوں جمعوں کے درمیان ایک نور روشن کر دیا جاتا ہے۔

ایک دوسری روایت میں جمعرات بتایا گیا ہے۔

اگر ہم ان ضعیف احادیث سے صرف نظر بھی کر لیں اور ان احادیث کو بعینہ قبول بھی کر لیں تو بھی اس طرح لوگوں کو جمع کر کے اس کی تلاوت کا کیا مطلب ہے۔

حضورؐ، خلفاء راشدینؓ اور جمہور امت نے سیکڑوں سال تک جمعہ کی نمازیں ادا کی ہیں۔ نہ تو انھوں نے جمعہ سے قبل سورہ کہف پڑھی اور نہ بعد میں۔

انھوں نے وہی کیا جو حضورؐ نے کیا اور اسے ترک کر دیا جسے حضورؐ نے ترک کر دیا تھا، یہی اصل سنت ہے۔

آج کل جمعہ سے قبل سورہ کہف کی تلاوت کے لیے قاری حضرات کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں، ان کی تنخواہیں مقرر کی جاتی ہیں اور پھر اچھی آواز سے پڑھنے والے قاریوں کا انتخاب کیا جاتا ہے۔

اور اس کے لیے فتاوی منگائے جاتے ہیں۔

بدعت اضافیہ کی ایک شکل اذان کے ساتھ درود کا جوڑنا بھی ہے، یہاں تک کہ عام لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ درود بھی اذان ہی کا ایک حصہ ہے۔

اذان کے کلمات کو تو منقول احادیث نے متعین کر دیا ہے حضورؐ، خلفاء راشدینؓ اور جمہور سلف کے دور میں اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا۔

جہاں تک حضورؐ پر درود بھیجنے کا سوال ہے تو یہ ایک دوسری سنت ہے جس کی اپنی جگہ اہمیت اور حکم ہے۔

جب مسلمان اذان سنتے ہیں تو ان کے لیے ان کلمات کا دہرانا مستحب ہو جاتا ہے اور پھر اذان ختم ہونے پر رسولؐ اللہ پر درود بھیجیں اور اللہ تعالیٰ سے ان۔ کے لیے وسیلہ، فضیلت اور مقام محمود طلب کریں۔

بعد میں لوگوں نے درود کے لیے عجیب وغریب کلمات وضع کیے اور پھر انھیں اذان کے کلمات کے ساتھ جوڑ دیا تا کہ پڑھتے وقت وہ اذان کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائیں۔

یہ نئی چیز اسلامی شعار میں دخیل بن کے آئی اور پھر موذن کو بھی آواز میں غنائیت اور جولانی دکھانے کا موقع ملا جبکہ وہ تو لوگوں کو اللہ کی طرف بلا رہے تھے۔

جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اذان ایک سر اور مدھم نغمہ بن کے رہ گئی جبکہ درحقیقت یہ ایک پُر ہیبت اور سنجیدہ ندا تھی۔

مذکورہ بالا مثالوں سے یہ حقیقت واشگاف ہو جاتی ہے کہ بدعت اضافیہ کی اکثریت ایک ثابت شریعت کی تعلیمات لے کر ان میں اپنی طرف سے تصرف اور اضافہ کر کے اس کی پرانی شکل کو بدل دیتی ہے۔

اسلام کی تعلیمات تو جسم کے اجزاء اس کے محسوسات اور اس کی صفات کی طرح ہیں۔

اگر پیر کو ہاتھ کی جگہ، کان کو ناک کی جگہ رکھ دیا جائے تو یہ جسم کے ساتھ زیادتی ہوگی، اگرچہ کوئی بھی شے باہر سے نہیں لائی گئی ہے۔

بدعت اضافیہ کے بارے میں علامہ شاطبیؒ کی مذکورہ باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ بدعت اضافیہ کے دو پہلو ہیں:

پہلا پہلو دلیلوں کے اعتبار سے ہوتا ہے جن کی رو سے وہ بدعت نہیں ہوتی۔
دوسرا پہلو اس کی ہیئت، ترتیب اور مقام میں تبدیلی ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ بدعت حقیقی کے بالکل مشابہ ہو جاتی ہے۔

چونکہ وہ دونوں پہلوؤں سے مکمل نہیں ہوتی ہے اس لیے اس کو بدعت اضافیہ کہا جاتا ہے۔

اصل کے اعتبار سے تو اس کے لیے دلیل ہوتی ہے لیکن کیفیت، حالت اور تفصیل کے اعتبار سے نہیں۔

کبھی کبھی تو اس کی بنیاد ایک موہوم مفروضہ پر ہوتی ہے اور کبھی کبھی تو کسی چیز پر بھی اس کی بنیاد قائم نہیں ہوتی۔

اسی وجہ سے یہ مسترد ہے کیونکہ تمام عبادات کا واحد ماخذ و مرجع صرف اور صرف شارع کی ذات اقدس ہے۔

ہم یہاں پر اس بات پر پھر زور دیتے چلیں کہ حضورؐ نے عام نصوص کی تفسیر اپنی سنت کے ذریعہ کر دی ہے لہٰذا ان کے بعد ان نصوص کی اصل یا ان کی ہیئت میں کوئی تبدیلی قبول نہیں کی جا سکتی۔

علامہ ابن حجرؒ سے اذان کے بعد اُس وقت کے معروف طریقہ کے بعد درود شریف پڑھنے کے بارے میں جب پوچھا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ اصل تو سنت ہے لیکن اس کی کیفیت بدعت ہے۔

U112025

یہاں پر قرآن شریف کی آیت:

یا ایھا الذین امنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما۔ اے ایمان والو! نبی پر درود اور سلام بھیجو۔

سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

کیونکہ اس درود کو کس طرح بھیجنا ہے اس کی کیفیت کے بارے میں ہم حضورؐ اور ان کے اصحاب سے زیادہ تو نہیں جان سکتے۔

مزید برآں لوگوں نے رجب میں اور پھر شعبان میں خصوصی نیتوں کے ساتھ نمازیں پڑھنی شروع کر دیں۔

علماء نے ان نمازوں پر نکیر کرنے میں تساہل سے کام لیا کیونکہ نماز بذات خود قابل اعتراض نہیں ہے۔

امام نوویؒ نے ان کے بارے میں صاف لفظوں میں کہا، ''دونوں نمازیں بدعت ہیں، من گھڑت ہیں، قابل نکیر ہیں اور قابل مذمت ہیں''۔

پھر اس کے بعد لکھتے ہیں، ان دونوں نمازوں کا ذکر قوت القلوب اور احیاء العلوم جیسی کتابوں میں ہونے سے ہرگز دھوکہ نہیں کھانا چاہیے۔

اسی طرح ان کا جواز حضور کی اس حدیث سے بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

''الصلوۃ خیر موضوع'' نماز بہترین موضوع ہے کیونکہ ان نمازوں کے ساتھ مخصوص ہے جو کسی بھی طرح شریعت کی مخالف نہیں۔

پھر مکروہ وقتوں میں نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔

لہٰذا اس حدیث کی عمومیت سے کسی عبادت میں تبدیلی یا کسی اطاعت میں جدت طرازی نہیں کی جا سکتی۔ اسی طرح تقرب الی اللہ کے ذریعہ کو کسی خاص رنگ میں رنگا نہیں جا سکتا کیونکہ یہ سب باتیں اللہ کی ہدایت کے مخالف ہوں گی۔

اسی وجہ سے علماء کرام نے جمعہ کے دن مسجد کے اندر اذان دینے کو بدعت اضافیہ قرار دیا ہے۔ اذان فی نفسہ ایک مشروع چیز ہے لیکن اس کی مکانیت کو بدعت قرار دیا گیا ہے۔

اسی طرح جنازوں کے سامنے بلند آواز سے ذکر کرنا اور قرآن پڑھنا بھی بدعت ہے۔ اللہ کا ذکر کرنا اور قرآن شریف کی تلاوت تو ثواب کا کام ہے لیکن اس طرح اور اس موقع پر پڑھنا بدعت ہے۔

یہی حال ستائیسویں رجب کو اور پندرویں شعبان کے روزے کا بھی ہے۔ روزہ رکھنا تو عین عبادت ہے لیکن اس کے لیے ان دنوں کی تخصیص بدعت ہے۔

ظاہر بات یہ ہے کہ ان بدعات پر عمل پیرا حضرات ایک اچھے کام کو دوسرے برے کام سے خلط ملط کر دیتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا پورا کا پورا عمل اچھا ہے اور اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ یہ ان کی سنت سے جہالت اور عدم واقفیت کی بات ہے۔ انھوں نے جاہل حضرات اور خواہشات کے غلام لوگوں سے جو کچھ بھی سنا ہے یا

دیکھا ہے اسی پر جمے رہنا چاہتے ہیں اور کچھ نہیں۔

بدعت کے دلدادہ لوگوں میں تعجب خیز حد تک یہ عادت پائی جاتی ہے کہ جب انھیں دین حق کے بارے میں بتایا جاتا ہے تو فوراً ہی بتانے والے شخص پر کوئی نہ کوئی تہمت جڑ دیتے ہیں۔

اگر ان سے کہا جاتا ہے کہ اذان کو ہمارے سلف صالح اور حضورؐ کی سنت مبارکہ ہی پر باقی رکھو تو وہ اس ناصح بر حق کے بارے میں فوراً ہی یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ ''یہ شخص تو حضورؐ سے نفرت کرتا ہے''۔

اس موقع پر استاذ عدوی رقم طراز ہیں:

''آپ جانتے ہیں کہ جو بھی اس بدعت پر نکیر کرتا ہے وہ اس کے دوسرے پہلو یعنی اس کے بدعت ہونے کے پہلو پر نکیر کرتا ہے''۔

ایسے موقع پر جب کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص دعا پر نکیر کرتا ہے یا ذکر کے خلاف ہے یا حضورؐ پر درود کو برا سمجھتا ہے یا تلاوت قرآن سے منع کرتا ہے تو اس کی یہ بات یا تو دین سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے یا نکیر کرنے والے کی بات وہ سمجھ نہیں پاتا ہے یا اس سے وہ سنت کے داعی کو بدنام کرنا چاہتا ہے۔

میرے ایک دوست نے مجھے بتایا کہ ایک شیخ صاحب نے ایک دین کی تعلیم دینے والے شخص کو بدنام کرنے کے لیے یہ طریقہ نکالا کہ وہ لوگوں کو بلاتے اور کہتے حضورؐ پر درود بھیجنے کے بارے میں تم لوگ کیا کہتے ہو؟ لوگ جواب دیتے یہ تو بڑے ثواب کا کام ہے۔ اس پر وہ شخص کہتا فلاں شخص اس کا انکار کرتا ہے۔

اس پر وہ شخص پھر سوال کرتا تم لوگوں کا استغفار اور قرآن کی تلاوت کے بارے میں کیا خیال ہے؟ لوگ کہتے یہ تو عین عبادت ہے اس پر وہ کہتا کہ فلاں شخص ان کو برا سمجھتا ہے۔

جب شیخ سے پوچھا گیا کہ تم اس طرح کی بات کیوں کرتے ہو جبکہ تمہیں معلوم ہے کہ وہ شخص کیا کہتا ہے؟ شیخ نے جواب دیا کہ میں لوگوں کو اس سے متنفر کرنا چاہتا ہوں تاکہ لوگ اس کی دوسری نصیحتوں کو نہ سنیں۔

اس طرح کے مفتی حضرات پہلے تو لوگوں کو بدعت کی گمراہی میں مبتلا کرتے

ہیں، پھر اچھے لوگوں پر بہتان لگاتے ہیں۔

بدعات وعبادات

بدعت عبادات میں بھی ہوتی ہے اور عادات میں بھی۔

جن عبادات کے ہم مکلف ہیں ان کی تعلیمات ہمیں صرف شارع سے ہی ملی ہیں۔ اگر ان کے بارے میں وحی نازل نہ ہوتی تو ہمیں ان کا علم نہ ہوتا اور نہ ہی ہم انھیں شارع کی بتائی ہوئی ترتیب کے ساتھ انجام دیتے۔

پانچوں نمازیں، ان کی رکعتوں کی تعداد، ان کے پڑھنے کے اوقات اور ان کی ادائیگی کے طریقے یہ سب دین نے وضع کیے ہیں۔ اسی طرح کی دیگر عبادات کی کیفیت اور کمیت میں عقل کو مطلق دخل نہیں ہے۔

کبھی کبھی ان عبادات میں مخفی حکمتوں کو ہم جانتے ہیں یا اللہ تعالٰی کے حکم کے مطابق انھیں انجام دینے کے اچھے نتیجوں سے باخبر ہوتے ہیں۔ مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان احکام میں ہمیں اپنی عقل استعمال کرنے کی آزادی ہے یا یہ عبادات کلی یا تفصیلی طور پر غور وفکر کی آماجگاہ بن سکتی ہیں۔

بلکہ ان تمام عبادات کا واحد مرجع عالم الغیب والشہادۃ کے احکام کی پیروی ہے اور کچھ نہیں۔

لیکن جہاں تک عام معاملوں کا سوال ہے تو زندگی میں ان کی پوزیشن دوسری ہے اس میں عقل وتجربہ کے لیے وسیع میدان موجود ہے۔

کیونکہ دین کی آمد سے قبل بھی عقل اور تجربہ کے لیے وسیع جولان گاہ موجود تھی۔ ہاں کبھی کبھی عقل وتجربہ دین کی ہدایات سے کافی دور چلا جاتا ہے۔ جس کے لیے شریعت نے کچھ حدود وآداب مقرر کردیے ہیں اور مومنوں کے لیے اس کی پابندی ضروری قرار دے دی ہے۔

مومن وکافر دونوں ہی کھاتے پیتے ہیں، شادی بیاہ کرتے ہیں، خرید وفروخت کرتے ہیں، کرایہ داری وغیرہ کے نظام وضع کرتے ہیں، امن وامان کے قانون بناتے ہیں اور عمرانیات وسیاسیات کے اصولوں پر عمل کرتے ہیں۔

یہ سب امور عادیہ ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے ان میں بھی لوگوں کو من مانی کرنے کی چھوٹ نہیں دی ہے بلکہ لوگوں کی ہدایت کے لیے بہت سی آیات نازل فرمائی ہیں۔ اسی طرح مفاد عام اور نقصان سے بچنے کے لیے بھی بہت سی آیات نازل کی ہیں۔

اسلام بذات خود مختلف گوشوں پر محیط ایک مکمل دین ہے۔

اس لیے نفس کی پاکیزگی اور سماج کی بھلائی پر اثر انداز ہونے والی ہر چیز کے ساتھ اس نے تعرض کیا ہے اور نصیحت کی ہے اور اس کے لیے کچھ نصوص اور قواعد وضع کیے ہیں۔

اور اگر دین کا دائرہ کار عبادات کی رسموں تک ہی محدود ہوتا، جس میں عقلی اجتہاد کی کوئی گنجائش نہ ہوتی اور پھر اس کے بعد عام معاملات میں قانون سازی کے لیے انسان کو بالکل آزاد چھوڑ دیا جاتا تو دین حد کمال کو کبھی نہ پہنچ پاتا اور پھر افراد و سماج کو ظلم و جور اور سرکشی سے بچانے میں قاصر رہ جاتا۔

اسلام کے گراں قدر محاسن کو سنوارنے میں مسجدوں کو اتنا دخل نہیں ہے جتنا کہ دقیق معاملات اور بلند و بالا روایات کا دخل ہے۔

اس لیے اس میں کوئی حرج نہیں کہ اسلام نے عام امور کے لیے مختلف قوانین وضع کیے ہیں۔ پھر ان قوانین کے نفاذ کو تقویٰ قرار دیا بالکل اسی طرح جس طرح کہ رکوع اور سجدہ کو قرار دیا ہے۔

ہم اللہ کی کتاب اور رسولؐ اللہ کی سنت میں ہزاروں ایسی نصوص پاتے ہیں جنھوں نے ان عام امور کو منظم کیا ہے۔ کوئی بھی شخص ان کی قدر و قیمت سے صرف نظر نہیں کر سکتا بالکل اسی طرح جس طرح عبادت کے معاملات کو دیگر نصوص نے منظم کیا ہے۔

مثال کے طور پر شادی بیاہ ہی کو لے لیجیے جسے بھی لوگ خواہ وہ کسی بھی مسلک کے پیروکار ہوں انجام دیتے ہیں۔

مگر اسلام نے اس کے لیے کچھ قوانین وضع کیے ہیں، جن کی بجا آوری ضروری ہے۔ ایجاب و قبول، مہر اور گواہ ہونا ضروری ہے۔ کوئی عورت عدت کے دوران شادی نہیں کر سکتی، تین بار طلاق دے کر پھر اسی عورت سے شادی نہیں ہو سکتی۔ مسلمان عورت غیر مذہب میں شادی نہیں کر سکتی۔ ہاں، ایک مسلمان مرد یہودی اور

عیسائی عورت سے شادی کر سکتا ہے۔

اپنے محرم سے شادی نہیں ہو سکتی، پھر جنسی اتصال کے بھی کچھ آداب ہیں جنھیں ازدواجی معاشرت کے عنوان کے تحت اسلام نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ان باتوں کو کوئی بھی مسلم نظر انداز نہیں کر سکتا۔

خرید وفروخت بھی عام امور میں آتے ہیں جس سے ہر کس وناکس کا واسطہ پڑتا ہے۔لیکن اسلام نے اس کے لیے بھی کچھ شرائط اور آداب مقرر کیے ہیں، جن کی پابندی ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔

خرید وفروخت کرنے والی دونوں پارٹیاں اس کی اہل ہوں، بیچی جانے والی چیز صاف ستھری اور قابل نفع ہو۔فروخت کرنے والے شخص کی ملکیت میں ہو اور وہ خریدنے والے کے حوالہ کرنے پر قادر بھی ہو۔

اس کے ساتھ ہی دھوکہ دھڑی، ذخیرہ اندوزی، سود اور ملاوٹ سے منع بھی کیا گیا ہے۔ان سب باتوں نے اسلامی تجارت کو انتہائی پاکیزہ اور انصاف پر مبنی بنا دیا ہے۔

مزید برآں انسان فطری طور پر کھاتا بھی ہے پیتا بھی ہے اور پہنتا بھی ہے لیکن اسلام نے ان عام امور کو بھی منظم کیا ہے۔بہت ساری کھانے پینے اور پہننے کی چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔

قرآن شریف نے حرام مال کو کئی جگہ بیان کر کے مشرکین اور قدیم اہل کتاب پر نکیر کی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں سب سے طویل آیتیں قرض، اس کی لکھا پڑھی کرنے اور اس پر گواہ مقرر کرنے کے بارے میں نازل فرمائی ہیں۔ہمارے ائمہ کرام نے اس سلسلہ میں وارد نصوص اور مقرر کردہ اصول وضوابط کی روشنی میں باقاعدہ قانون سازی کی ہے۔اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ عام مصلحت اور مفاد عامہ ہی اصل مقصود ہے۔

اور بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ بہت سے عام معاملات میں لوگوں کے نقطۂ نظر اور شریعت کے نقطہ نظر میں غیر معمولی موافقت رہی ہے۔

میں نے بہت ساری قدیم شہری قانون کی تصریحات کو دیکھا ہے۔ جنھیں قانون وضع کرنے والوں نے مفاد عامہ کے پیش نظر نئے قانون میں ڈھال دیا ہے۔

میں یہ دیکھ کے حیران رہ گیا کہ قدیم قانون کسی ایک مجتہد فقیہ کے مذہب پر مبنی تھا تو جدید قانون کسی دوسرے فقیہ کے مسلک پر مبنی ہے۔

یہاں پر اور کچھ نہیں بس فرق صرف اتنا تھا کہ مسلمان فقہاء اللہ پر ایمان کے جذبہ کے تحت، اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے، اللہ کی شریعت میں تفقہ کے لیے اور اس کے ذریعہ لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے ان عام معاملات کو اسلام کی تعلیمات کے مطابق ڈھالتے تھے۔ لیکن آج کل عام قانون کے ماہرین اللہ کی رضا اور اسکے دین کے احترام کو مدنظر نہیں رکھتے۔

عادات کو دین کے رنگ میں رنگ دینا۔ جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ ہمارے دین کی فطرت کا ایک حصہ رہا ہے۔

تو کیا ان عادات میں بدعت کا داخلہ بالکل اسی طرح ہوگا جیسا کہ عبادات میں ہوتا ہے۔

شاطبیؒ کہتے ہیں کہ آخر اس کا مطلب کیا ہے؟

شرعی اصول کے مطابق ہر عادت میں عبادت کا پہلو ہوتا ہے۔ اگر اس کے امر ونہی کی حقیقی وجہ معلوم نہ ہو اور یہی چیز عبادت کہلاتی ہے۔

لیکن جس کے معنی معلوم ہوں، اس کے فائدے اور نقصانات کا علم ہو تو یہ عام عادت کہلاتی ہے۔

لہٰذا طہارت، نمازیں روزہ اور حج سب کی سب عبادات ہیں، جبکہ خرید و فروخت، نکاح، طلاق، کرایہ داری، تعزیرات یہ تمام چیزیں عادات ہیں۔ کیونکہ ان کے احکام کا مطلب سمجھ میں آتا ہے۔ پھر ان میں عبادت کا بھی پہلو ہے کیونکہ یہ شرعی امور کے ساتھ مقید ہیں جن میں مکلف کو اختیار نہیں دیا گیا ہے خواہ یہ واجب العمل ہوں یا کرنے یا نہ کرنے کا مجاز بنایا گیا ہو۔

کیونکہ عبادات میں اختیار بھی لازمی ہوتا ہے جبکہ لازمی تو بہر حال لازمی ہی ہوتا ہے۔ کتاب الموافقات میں اسے بادلیل ثابت کیا گیا ہے۔

اگر معاملہ یہی ہے تو عبادات کے معنی میں دونوں قسمیں مشترک ہیں۔ اب اگر بدعت عادی امور میں اس پہلو سے داخل ہوتی ہے تو عبادات کی طرح عادات میں بھی اس کا داخلہ ہو سکتا ہے ورنہ نہیں۔

اور اس باب کا حکم اسی نقطہ کے ارد گرد گھومتا ہے۔

یعنی عادی زندگی کے معاملات کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک تغیر پذیر جو ترقی اور تبدیلی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

ان معاملات میں اسلام کوئی قید و بند نہیں لگاتا اور نہ ہی اس میں اتباع محض یا بدعت کی پرواہ کرتا ہے۔ بلکہ ایسے امور میں اس ثابت و قائم نص کے مطابق عمل کرنا چاہیے کہ ''تم اپنی دنیا کے معاملات کو زیادہ جانتے ہو''۔

یہ پہلو ہماری بحث کا موضوع نہیں ہے۔ اس بارے میں ہم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہر مسلمان کو اسے حضور قلب اور حسن نیت کے ساتھ قبول کر لینا چاہیے۔

کیونکہ اعلیٰ اخلاق کا آدمی اپنا مقصود حاصل کرنے کے لیے ہر چیز سے فائدہ حاصل کرتا ہے۔

اگر ایک مسلمان اپنے ہر عمل سے اللہ کی مرضی چاہتا ہے تو اس کا ہر کام عبادت ہو جاتا ہے۔ اس کا کھانا پینا، بیوی کے ساتھ خوش فعلی بھی عبادت ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر وہ ملازم ہے تو اس کی ملازمت، اگر وہ تاجر ہے تو اس کی تجارت اور اگر کسان ہے تو اس کی کھیتی باڑی سب عبادت میں شمار ہوتی ہے۔

مذکورہ بالا چیزوں کا تعلق اگرچہ عادات سے ہے مگر ان کے پیچھے نیک مقاصد اور تقویٰ کا جذبہ اسے نماز اور جہاد کا درجہ دیتا ہے۔

عادات سے متعلق یہ سب چیزیں اگرچہ قید و بند سے مستثنیٰ ہیں اور شریعت نے بھی ان کے لیے نہ تو کسی وسیلہ کا تعین کیا ہے اور نہ ہی کوئی صورت گری کی ہے لیکن ان میں جدت پسندی انھیں خوب سے خوب تر بنا دیتی ہے۔

لیکن عبادات کے معاملے میں شریعت نے اس کی آزادی نہیں دی ہے بلکہ ان میں تقلید اور اتباع محض درکار ہوتی ہے۔

دین روز مرہ کے معاملات میں دخل نہیں دیتا خواہ وہ تجارتی معاملات ہوں یا سماجی، سیاسی ہوں یا تعزیری تا کہ لوگ تنگی میں مبتلا نہ ہوں۔

ہاں، یہ بات ضرور ہے کہ کھلی ہوئی چھوٹ ہرگز نہیں دیتا تھوڑا بہت دخل رہتا ہے اور وہ بھی صرف بے جا مشقت دور کرنے کے لیے۔ شیطان کے راستوں کو بند کرنے کے لیے اور، ام لوگوں کو خود ساختہ قوانین شر سے محفوظ رکھنے کے لیے تا کہ وہ ذاتی میلانات اور جذبات کا شکار نہ ہو جائیں۔

یہاں پر آ کے آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس صورت حال میں بدعت کی گنجائش ہی کہاں باقی رہتی ہے۔ جہاں تک عادات کا تعلق ہے تو لوگ اپنی سمجھ کے مطابق اس کی مختلف صورتوں میں اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے اضافے کر لیتے ہیں۔ لیکن عام امور میں یہ بات نہیں ہو سکتی کیونکہ ان میں شریعت کا کام صرف معاملات کو منظم کر دینا ہے اور کچھ نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ لوگ تو اپنے مفاد کا راستہ کسی طرح نکال ہی لیتے ہیں اور پھر اسے فرمان الٰہی کا رنگ دے کر اس کی معاونت کو اللہ کی اطاعت قرار دے دیتے ہیں تا کہ جن چیزوں کو وہ مفاد یا مصلحت کے نام سے باقی نہیں رکھ سکتے اللہ کے نام سے اسے باقی رکھ سکیں۔

مثال کے طور پر کسی قوم میں شاہی نظام ہی کو لے لیجئے۔ شاہان وقت اس نظام کی بقا کے لیے اسے اللہ اور اس کے رسولؐ سے جوڑ دیتے ہیں۔ اور پھر قوم کی قیادت بھی وراثت کی طرح موروثی بن جاتی ہے اور پھر اس کے لیے بیعت بھی یہ کہہ کر لی جاتی ہے کہ یہ اللہ کی اطاعت ہوگی اور بیعت سے روگردانی اسلام کے قلعہ میں شگاف ڈالنا ہوگا۔

منصب کی وراثت کا قائل تو کوئی بھی مذہب نہیں ہے۔

علماء کے مطابق عادی معاملات میں یہ بھی حرام بدعت کی ایک قسم ہے۔ اسی طرح اپنی ذاتی خواہشات کے مطابق عوام پر ٹیکس لگا کے ان کی وصولی یہ باور کرا کے کرنا کہ اس میں اللہ، اس کے رسولؐ اور اولوالامر کی اطاعت ہے۔

عوام کو یہ باور کرانا کہ جو کچھ تم سے لیا جا رہا ہے وہ بھی دیگر شرعی فرائض کی

طرح ایک فریضہ ہے، اس کو بدعت قرار دینے کی بنیادی وجہ ہے۔

اگر آپ یہ پوچھیں کہ اگر اس میں یہ پُر فریب تخیل نہ پیدا کیا جاتا تو اس کا حکم کیا ہوتا؟

میرا کہنا یہ ہے کہ تب اسے نصوص اور اصول وضوابط کی کسوٹی پر رکھا جاتا۔ اگر اس کے معیار پر پورا نہ اترتا تو معصیت ہوتا ورنہ اس کو بھی تغیر پذیر عادی امر قرار دے کر نظر انداز کر دیا جاتا۔

ایسے موقع پر ہم کہہ سکتے تھے کہ ذاتی خواہشات پر مبنی ٹیکس چوری، غصب جیسا ہے اور اسے مفاد عامہ کہہ کر وصول کرنے والی بات غلط ہے۔

ایسے موقع پر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اگر کوئی قوم برطانیہ جیسی بادشاہت کا نظام قائم کرنا چاہتی ہے۔ جس میں صرف مفاد عامہ ہی مطلوب ہوتا ہے تو اس کی تائید کرنے والا اللہ کا اطاعت گذار اور مخالفت کرنے والا اللہ کا نافرمان نہیں قرار دیا جا سکتا۔ یہ ایک عادی معاملہ ہوتا جس میں اسلام کو کچھ لینا دینا نہیں ہوتا۔

استاذ عدوی کہتے ہیں:

بالکل یہی بات عادات میں جدت طرازی کی بھی ہے، مساجد کو اس طرح مزین کرنا کہ وہ نمازیوں کے دلوں کو متوجہ کر لے یا ان میں اس طرح کے نقش ونگار بنائے جائیں کہ وہ نمازی کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لے۔

اسی طرح مساجد میں بیش قیمت قندیل وفانوس لٹکانا بھی ہے۔ اکثر لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس سے اللہ کے گھر کی شان دوبالا ہوتی ہے تا کہ یہ خرچ اللہ کے راستے میں کیا جانے والا خرچ سمجھا جائے۔

لیکن اس اعتبار سے یہ بھی ایک مذموم بدعت سمجھی جائے گی۔ ہاں، مساجد کو پختہ بنانا، انھیں مناسب حد تک اونچی بنانا، ان کی دیواروں کو صاف ستھرا رکھنا اور ان پر ایسا رنگ وروغن لگانا جو نمازی کے دل کو متوجہ نہ کر سکے اور ان پر ایسا فرش بچھانا جو سادگی یا اعتدال سے تجاوز نہ کرے۔ ان سب باتوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو تعمیر مسجد ہے جسے اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھنے والے لوگ کرتے ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ عام امور میں اگر بدعت داخل ہوتی ہے تو صرف اس

کے عبادتی پہلو ہی سے داخل ہوتی ہے۔

تو نتیجہ یہ نکلا کہ مذموم بدعت خالص عادات میں نہیں ہوتی ہے۔

جیسا کہ کھانے، پینے اور سونے وغیرہ میں ہے۔ یہ تمام چیزیں عادی ہیں مگر ان میں عبادت کا پہلو داخل ہو گیا ہے، ان عادات والی چیزوں میں شریعت نے صرف حد بندی کر دی ہے جن کی پابندی بہر حال لازمی ہے۔ مثال کے طور پر شریعت نے کپڑے کو تکبر کی وجہ سے لمبا کرنے سے منع کیا ہے۔ اسی طرح سے کھاتے اور پیتے وقت بسم اللہ پڑھنے کا حکم دیا ہے اور بے جا فضول خرچی سے منع کیا ہے غیرہ وغیرہ۔

تمام مذکورہ باتیں عادی تھیں مگر عبادت کے راستے سے ان میں بدعت داخل ہو گئی۔

لہذا مذکورہ بالا عادات میں اگر عام عادت سے ہٹ کر کسی عادت کو خواہ مخواہ دینی رنگ دے دیا جائے تو اس اعتبار سے یہ بدعت اور معصیت ہوگی کیونکہ یہ چیز شریعت کی حد بندی سے باہر جا رہی ہے اور شریعت کی مخالفت کی وجہ سے یہ بدعت میں داخل ہو گئی۔

کیا عادات میں بھی سنتیں ہوتی ہیں؟

جب دین عادی زندگی میں داخل ہوتا ہے تو وہ بہت ہی محدود طور سے داخل ہوتا ہے اور وہ بھی صرف اسی حد تک جس حد تک وہ حسن اخلاق اور مفاد عامہ کی حفاظت کر سکے۔ اس کا مقصد کسی بھی طرح نت نئی ایجادات یا آفاق میں انسانی سرگرمیوں کو پابجولاں کرنا نہیں ہوتا۔ ہرگز ہرگز نہیں......

کیا مشرق و مغرب میں جو قوانین وضع کیے گئے اور پھر لاگو کیے گئے ہیں، ان کا مقصد ذہنی پرواز یا انسانی امنگوں پر روک لگانا تھا؟

کیا اجتماعی تقریبات ایک دوسرے کے یہاں آمد و رفت اور دعوتوں وغیرہ کے رسم و رواج کا مقصد زندگی کے پہیے کو ایک جامد راستے پر چلانا ہے؟

ان معاملات میں اسلام کا عمل دخل بالکل اسی طرح ہے جس طرح کہ لوگ ان عادات اور رسم و رواج کو ہنسی خوشی قبول کر لیتے ہیں۔

کھانے پینے کے بارے میں حضورؐ سے منقول احادیث بھی بالکل ویسی ہی ہیں جیسے آج کل لوگ کھانے کی میز پر آداب اختیار کرتے ہیں۔ لہٰذا ان احادیث کی نوعیت بھی بالکل ویسی ہی ہے۔

لیکن کچھ مسلمانوں نے دین اور ان عادات کے درمیان تعلق کو سمجھنے میں غلطی کی ہے۔

کچھ لوگوں نے تو یہ باور کرلیا کہ حضورؐ کے بعد ہر نئی چیز بدعت ہے اور اسے قبول نہیں کیا۔

اور کچھ لوگوں نے تو حضورؐ کی عادتاً کی جانے والی چیزوں کو بھی دین سمجھ لیا اور اسے عبادت اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ سمجھتے ہوئے اس سے چمٹے ہوئے ہیں۔

جبکہ یہ دونوں فریق غلطی پر ہیں۔ حضورؐ کے زمانہ میں اور پھر صحابہ کرامؓ کے دور میں غیر موجود عادی چیزوں میں نئے پن کو رد کرنا جائز نہیں ہے اور نہ ہی انھیں بدعت قرار دے کر انھیں نفرت انگیز بنایا جا سکتا ہے۔

یہ وہ بدعت نہیں ہے جس سے شریعت آمادۂ جنگ ہے۔

مثال کے طور سے میں لوگوں کے اس مقولہ کو یہاں پر نقل کر رہا ہوں:

عہد رسالت کے بعد سب سے پہلے چار چیزوں کا چلن ہوا: چھلنی سے آٹا چھاننا، پیٹ بھر کے کھانا کھانا، صابن کی طرح ایک گھاس سے ہاتھ دھونا اور دستر خوان پر کھانا کھانا۔

عادی چیزوں کو انھیں چار چیزوں میں محدود کرنے کی وجہ ہمیں معلوم نہیں ہے اور نہ ہی ہم یہ جانتے ہیں کہ لوگ ان سے خوف کیوں کھاتے ہیں۔

امام ابو حامد غزالیؒ اس قول کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "ہم یہ نہیں کہتے کہ دستر خوان پر کھانا مکروہ یا حرام ہے کیونکہ اس سے نہی ثابت نہیں ہے۔ رہی یہ بات کہ یہ حضورؐ کے بعد ایجاد ہوئی ہے تو ہر ایجاد سے روکا نہیں گیا ہے بلکہ صرف ان ایجادات سے روکا گیا ہے جو کسی ثابت سنت کے خلاف ہوں یا کسی شرعی حکم کو ساقط کرتی ہوں جبکہ وہ حکم برقرار ہے۔

صرف یہی نہیں بعض حالات میں اسباب بدل جانے سے ایجادات

ضروری ہو جاتی ہیں۔ رہی دستر خوان کی بات تو اس میں اور کوئی غلط بات نہیں ہے صرف کھانے کو زمین سے قدرے اونچا کر دیا گیا ہے تاکہ کھانے میں آسانی ہو اور کچھ بھی نہیں۔

ایسی چیزوں میں کوئی کراہت نہیں ہے۔

اور پھر یہ چاروں چیزیں جنھیں بدعت قرار دیا گیا ہے وہ درجہ میں بھی برابر نہیں ہیں۔ اشنان گھاس صابن کی طرح صفائی میں معاون ہوتی ہے اس لیے اس سے ہاتھ دھونا بہتر ہے۔

حضورؐ کے دور میں اس کا استعمال نہیں تھا کیونکہ لوگ اس کے عادی نہیں تھے اور یا تو یہ آسانی سے دستیاب نہیں تھی۔

جہاں تک چھلنی کا سوال ہے تو اس سے کھانے کو پر تکلف بنانا مقصود ہوتا ہے جو مباح ہے بشرطیکہ اس میں اسراف نہ ہو۔

پیٹ بھر کے کھانا ان چاروں میں سب سے بری چیز ہے کیونکہ اس سے شہوت پیدا ہوتی ہے اور یہ جسمانی بیماریوں کا بھی سبب بنتا ہے۔

لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ امام غزالیؒ کا اس طرح دفاع کرنا مناسب نہیں ہے اگر چہ ان کا مقصد نیک تھا۔

کیونکہ انھوں نے بھی اس نظریہ کو قبول کر لیا کہ عادات میں تجدید بھی بدعت ہے پھر اس کے بعد انھوں نے اس کے خراب یا اچھے نتائج پر بحث کی۔

میرے خیال میں شروع ہی میں اسے بدعت قرار دیا جانا غلط سمجھا جاتا تو زیادہ بہتر تھا اور انہی مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں جنھیں ہم نے بیان کیا ہے۔

امام ابوحامد غزالیؒ کے خیال میں بھی زمین پر کھانا دستر خوان پر کھانے سے بہتر ہے کیونکہ حضورؐ نے کبھی دستر خوان پر نہیں کھایا تھا۔

میرے نزدیک دونوں طرح صحیح ہے کیونکہ ان کا تعلق عادات سے ہے، جن میں عبادت کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔

مذکورہ تمام باتوں میں تقرب الی اللہ کا دور دور تک خیال نہیں تھا۔ اگر دستر خوان پر کھانا برا ہوتا تو اس سے ضرور منع کیا گیا ہوتا اور اگر زمین پر کھانا بہتر ہوتا تو

ضرور اس کا حکم ہوتا۔

یہاں میں ایک سوال کرتا ہوں: کیا وہ عادات جنھیں رسول اللہؐ نے کیا ہے دین سمجھی جائیں گی؟ اس کے کرنے والے کو ثواب اور چھوڑنے والے کو گناہ ہوگا؟

علماء اسلام نے اس بات کا بہت ہی تفصیل سے جواب دیا ہے۔ جس کا میں تذکرہ کرنا مناسب سمجھوں گا۔

تمام علماء اس بات پر متفق ہیں کہ جن باتوں کو حضورؐ نے بشری تقاضوں کے تحت کیا ہے، امت کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی اس کی اتباع پر مجبور کیا جائے گا۔

مجھے معلوم ہے کہ حضرت خالدؓ بن ولید نے گوہ کھائی مگر حضورؐ نے اسے تناول نہیں فرمایا کیونکہ آپ کی قوم اسے کھانے کی عادی نہیں تھی۔

مگر حضرت خالدؓ کا یہ عمل ایسا نہیں تھا کہ اس پر نکتہ چینی کی جائے۔

لیکن جن امور کو حضورؐ نے رسالت کے دائرہ کار سے باہر رہتے ہوئے انجام دیا ہے، نہ تو وہ اللہ کے احکام ہیں اور نہ ہی لوگوں کی تعلیم و تربیت سے اُن کا سروکار ہے تو تحقیقی بات یہ ہے کہ لوگوں کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ جو حضورؐ نے کیا ہے وہ کریں اور جنھیں چھوڑ دیا ہے وہ بھی چھوڑ دیں۔

اس سلسلہ میں علماء کے اقوال نقل کرنے سے قبل ہم یہ بات بتانا چاہیں گے کہ محبت کے تو راستے ہی جداگانہ ہوتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے کسی پر بھی ان کو لازم یا ضروری نہیں کیا ہے۔

اب یہ بات جو حضرت ابن عمرؓ کے بارے میں کہی جاتی ہے کہ وہ تو حضورؐ کے نشان قدم تلاش کرتے ہوئے ان راستوں سے گذرتے تھے اور جہاں جہاں آپؐ نے قیام فرمایا تھا وہ بھی وہاں قیام کرتے تھے خواہ ضرورت ہو یا نہ ہو۔

تو یہ حضرت ابن عمرؓ کا اپنا عمل تھا۔ انھوں نے اپنے اوپر وہ چیزیں لازم کر لی تھیں جو لازم نہیں تھیں۔

جمہور صحابہؓ نے اس پر عمل نہیں کیا اور نہ ہی انھوں نے اس کو باعث ثواب سمجھا۔

حضرت ابن عمرؓ ہی کی طرح ایک دوسرے صحابی حضرت معاویہؓ بن قرہ اور ان

کے والد تھے۔

ابن حبان حضرت معاویہ ابن قرۃؓ کے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں قبیلہ مزینہ کی ایک جماعت کے ساتھ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ سے بیعت کی اُس وقت آپؐ نے کرتے کے بٹن کھول رکھے تھے۔

حدیث کے راوی بیان کرتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے حضرت معاویہؓ اور ان کے باپ کو ہمیشہ خواہ گرمی ہو یا سردی بٹن کھولے ہوئے ہی دیکھا۔

کوئی بھی عالم دین بٹن کھولنے کو سنت قرار نہیں دیتا اور اس پر بعض صحابہ کرامؓ کا عمل ہمارے لیے بھی ضروری اور لازمی نہیں ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جن امور کو حضورؐ نے انجام دیا تھا مگر ان سے مراد اللہ کا تقرب یا ثواب نہیں تھا ان کے بارے میں ہمارا موقف کیا ہونا چاہیے، اس بارے میں علماء سے مختلف اقوال منقول ہیں۔

کچھ علماء کا خیال ہے کہ یہ اعمال ہمارے لیے مستحب ہیں۔

کچھ علماء کہتے ہیں کہ اسے کر بھی سکتے ہیں اور چھوڑ بھی سکتے ہیں۔

جبکہ بعض ناعاقبت اندیش علماء اس بات کے قائل ہیں کہ یہ اعمال ہمارے لیے لازمی ہیں لیکن کچھ علماء ان میں توقف کرتے ہیں۔

میرے نزدیک اس مسئلہ میں آمدی کا قول برحق ہے جس کی تائید عدوی نے بھی اپنی کتاب ''السنن والبدع'' میں کی ہے کہ حضورؐ کا عمل محض اس بات کی دلالت نہیں ہے کہ وہ فعل باعث ثواب ہے بلکہ اس بات کی دلالت ہے کہ یہ فعل حرام نہیں ہے۔

رہی بات ثواب کی تو یہ بالکل ہی دوسری چیز ہے۔

صحابہ کرامؓ دین کے بارے میں سب سے زیادہ جانتے تھے اور ثواب کے تمام کاموں میں اللہ کے رسولؐ کی اتباع کرنے کے سب سے زیادہ مشتاق تھے جب وہ حضورؐ کا ایسا کوئی عمل دیکھتے جس سے اللہ کی قربت کا قصد نہ ہوتا تو وہ بھی اسے دین کا ایک جزء سمجھ کے اختیار نہ کرتے اور نہ ہی لوگوں کو اسے اختیار کرنے کی دعوت دیتے، سیرت نبوی میں اس طرح کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں۔

۱۔ حضورؐ جب مدینہ کی طرف ہجرت کر رہے تھے تو ساحلی راستہ اختیار کیا تھا کیونکہ وہ دشمن سے محفوظ ترین راستہ تھا۔

اب آپ کا یہ عمل اگر باعث قربت ہوتا تو ہر مسافر یہی راستہ اختیار کرتا خواہ وہ زیادہ فاصلہ والا ہی کیوں نہ ہوتا۔

لیکن کسی بھی صحابیؓ نے ایسا نہ کیا اور نہ کہا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ شرعی طور سے مسنون نہیں ہے۔

۲۔ حضورؐ اور آپ کے یار غار حضرت ابوبکر صدیقؓ کئی روز تک غار ثور میں چھپے رہے اور پھر کچھ دنوں کے بعد آگے سفر کیا۔

اگر آپ کا یہ عمل سنت ہوتا تو آپ کی بعد صحابہ کرامؓ بھی ایسا ہی کرتے لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ غار میں چھپے رہنا اور اس میں عبادت کرنا مقصود نہیں تھا۔

۳۔ حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آپ کی دونوں چپلوں میں دو تسمے تھے۔ یہ حدیث صحیح مسلم کے علاوہ صحاح ستہ کی دیگر پانچوں کتابوں میں مذکور ہے۔

کیا ایسا ہی جوتا یا چپل پہننا سنت ہے اور جو ایسا نہیں پہنتا وہ سنت کا تارک ہوگا۔ ایسا تو کوئی بھی نہیں کہتا۔

۴۔ حضورؐ نے غزوہ بدر کے موقع پر پانی کے قریب جب پڑاؤ ڈالا تو حضرت حبابؓ ابن منذر آپؐ کے پاس آئے اور کہا اے رسولؐ اللہ کیا آپ نے یہاں پر پڑاؤ اللہ کے حکم سے ڈالا ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر ہم آگے پیچھے نہیں بڑھ سکتے یا آپ نے ذاتی رائے اور جنگی مصلحت کی وجہ سے ایسا کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ صرف ذاتی رائے اور جنگی مصلحت ہے۔

یہ سن کر انھوں نے اپنی جگہ بدل دی اور پھر حضورؐ نے فرمایا میں نے اپنی رائے کا اظہار کیا اور انھوں نے اپنی رائے پر عمل کیا۔

اس واقعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کبھی کبھی حضورؐ اپنی ذاتی رائے کے مطابق عمل فرماتے تھے جس میں وحی وغیرہ کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا تھا۔

ایسے کاموں میں مسلمانوں کے لیے ان پر عمل ضروری نہیں ہے اور وہ اپنی

صواب دید کے مطابق عمل کر سکتے ہیں۔

حضورؐ نے بھی حضرت حباب کی ذاتی رائے کی منظوری دی اور انھوں نے اس پر عمل بھی کیا۔

اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ عادات سے متعلق مسائل کو بھی دین کے دائرہ کار میں لانے سے اللہ کے دین کو اور لوگوں کی دنیا دونوں کو بے پناہ نقصان پہنچے گا۔

اللہ کے دین کو اس طرح نقصان پہنچے گا کہ عبادات کے دائرہ کار کو اتنا وسیع بنا دے گا کہ اس کی سرحدیں خالص وہم کے ساتھ خلط ملط ہو کر رہ جائیں گی۔

اور پھر قربت وثواب کے لیے ایسی باتیں لازمی بنا دی جائیں گی جو درحقیقت قربت وثواب سے تعلق ہی نہیں رکھتی تھیں۔

اسلامی ماہرین اس حقیقت سے واقف ہیں کہ حضورؐ کی سیرت مبارکہ میں ایسی باتیں ہیں، جو لوگوں کے دلوں کو جلا بخشتی ہیں اور ان کو پاکیزگی عطا کرتی ہیں۔ ان میں کسی اضافے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ عادی چیزوں میں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے سنت کی اتباع کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب ہوگا اصل اور مقصود بالذات سنتوں اور واجبات میں کمی اور کوتاہی جو کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ بہت سارے لوگ جو نفس کی پاکیزگی اور دشمن سے جہاد کرنے میں رسول اللہؐ کی سنت کا اتباع کرنے سے تو قاصر ہیں لیکن رسولؐ کی اس محکم سنت کو چھوڑ کے ان کی محبت کا دم بھرتے ہوئے حلوہ کھانے سے گریز نہیں کرتے۔ وہ صرف حلوہ کھانے کے لیے رسول اللہؐ کی سنت کا دم بھرتے ہیں اور ان کے آثار کی اقتدا کرتے ہیں۔

حالانکہ یہ بھی ممکن ہے کہ عادات پر مبنی حضورؐ کا یہ فعل اس ماحول کی دین ہو، جس میں آپؐ نے آنکھیں کھولی تھیں اور جس میں آپ کی نشوونما ہوئی تھی۔

یعنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کام اس گرم علاقہ کے مسلم اور مشرک دونوں ہی کرتے ہوں۔

مثال کے طور پر آپ گرمی سے بچنے کے لیے سفید کپڑے پسند کرتے ہوں اور پھر جب کوئی کپڑا آپ سر پر رکھتے ہوں تو سورج کی تپش سے بچنے کے لیے سر کے پیچھے کپڑا لٹکتا ہوا چھوڑ دیتے ہوں۔ اب کیا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ٹھنڈے ملک کے باشندے بھی سفید کپڑا پہنیں اور اپنے پیچھے شملہ لٹکائیں جیسا کہ حضورؐ نے لٹکایا تھا؟

انصاف کی بات تو یہ ہے کہ یہ عادت کی چیزیں خواہ عملی ہوں یا قولی، اسلام کا پیغام نہیں ہیں۔

کیونکہ اس طرح کی سوچ سے تو دنیا کے لوگ پریشانی میں پڑ جائیں گے۔ دنیاوی چیزیں مسلسل ترقی پذیر ہوتی ہیں اور ان میں کمی، زیادتی یا بے توجہی کے سلسلے میں مسلسل کاوشیں ہوتی رہتی ہیں۔

ایسے حالات میں ان عادات کے کسی ایک جزء پر دین کی مہر لگا کر اسے جامد اور شل کر دینے سے انتہائی خطرناک فکری اور تمدنی جمود پیدا ہو جائے گا۔

زندگی کے کچھ میدانوں میں مسلمانوں کی پس ماندگی شاید اس وجہ سے بھی ہے کہ انھوں نے بذات خود اپنے اوپر اسلام کے نام سے بہت سی پابندیاں عائد کرلیں۔

اور پھر وہ ان موہوم زنجیروں میں اس طرح جکڑ کے رہ گئے کہ وہ حرکت بھی نہ کر سکے جبکہ دوسری قومیں بغیر کسی پابندی کے آزاد فضا میں گھومتی رہیں۔

وہ اس باطل قید و بند کے احترام میں اس قدر محو رہے کہ وہ روحانی اور ذہنی کمال کی بیڑیوں کو فراموش ہی کر بیٹھے جو کہ دین کا اصل مقصد اور مقصود تھیں۔

یہیں سے نہ تو وہ دین کے رہے اور نہ ہی دنیا کے اور اس طرح دونوں میدانوں میں بیک وقت شکست سے دوچار ہو گئے۔

آخر میں میں بدعت کے اس موضوع کو مصر کی مقتدر علمی شخصیت شیخ محمود شلتوت کے اس علمی نقطہ نظر پر ختم کرنا چاہتا ہوں جس میں انھوں نے بدعت کا بہت ہی باریکی کے ساتھ جائزہ لینے کے بعد لکھا ہے۔

"ہمیں تمام مذاہب کی تاریخ سے یہ معلوم ہوا ہے کہ بدعت کے ذریعہ تحریف تین راستوں سے داخل ہوتی ہے۔

الف) عقیدہ کے راستے سے جہاں پر شرک داخل ہوتا ہے، غیر اللہ کی عبادت

ہوتی ہے، اس سے دعا مانگی جاتی ہے، اس سے مدد مانگی جاتی ہے اور اسے ماوی وملجا سمجھا جاتا ہے۔

ب) عبادت کے راستے سے جہاں پر عبادت کے طور طریقوں کو بدل دیا جاتا ہے، عبادت میں زیادتی یا کمی کردی جاتی ہے۔

ج) حلال وحرام کے راستے سے جس میں حرام کو حلال اور حلال کو حرام کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

بدعات کن راستوں سے داخل ہوتی ہیں ان کا جائزہ لینے والا دیکھے گا کہ کچھ بدعتیں شروع میں اختراع کی گئیں اور کچھ چیزیں ایسی تھیں جنھوں نے بدعت کے اس عمل کو پھیلانے میں مدد کی۔

ہم ان دونوں چیزوں کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں۔

بدعت کے اسباب

بدعت کے تین اسباب ہوتے ہیں:

۱۔ احکام کے ذرائع سے ناواقفیت یا ان ذرائع کو سمجھنے والے وسائل سے ناواقفیت۔

۲۔ احکام کے استنباط میں اپنی خواہش کی پیروی۔

۳۔ شرعی امور میں عقل کے استعمال کو بہتر سمجھنا۔

مختصر طور سے ہم ان تینوں اسباب پر اس طرح نظر ڈالتے ہیں:

جہاں تک پہلے سبب کا تعلق ہے تو اس کے دونوں مذکورہ بالا پہلوؤں میں خلل کے راستوں پر بحث کرنے سے پہلے ہم آپ کو یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ شرعی احکام کے ذرائع جیسا کہ سبھی کو معلوم ہے اللہ کی کتاب، رسول اللہ کی سنت اور پھر اجماع وقیاس ہیں۔

دراصل ان ذرائع کی عام اصل کتاب اللہ ہے پھر سنت رسول اللہؐ ہے پھر اجماع ہے اور پھر قیاس۔

لیکن عبادات میں قیاس کا کوئی عمل دخل نہیں ہے کیوں کہ قیاس میں ایک حکم کو

جس میں علت ہوتی ہے دوسرے بغیر علت والے حکم پر قیاس کیا جاتا ہے۔ جبکہ عبادت میں ایسا نہیں ہوتا ہے۔ عبادت تو محض اطاعت گذاری اور حکم کی بجا آوری ہے اور بس۔

لیکن جہاں تک سبب اول کے دونوں پہلوؤں میں خلل کا تعلق ہے تو اس کی چار صورتیں ہوسکتی ہیں:

۱۔عربی زبان کے اسلوب سے ناواقفیت۔

۲۔سنت رسولؐ سے ناواقفیت۔

۳۔قیاس کی حیثیت سے ناواقفیت۔

۴۔محل قیاس سے ناواقفیت۔

عربی زبان کے اسلوب سے ناواقفیت کے نتیجے میں قرآن کی کچھ نصوص کو غلط ڈھنگ سے سمجھا گیا جس کی وجہ سے ایسی باتیں پیدا کی گئیں جن سے اسلاف واقف نہیں تھے۔ مثال کے طور پر:

کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ سور کا گوشت حرام ہے، چربی نہیں، کیونکہ قرآن میں تو صرف گوشت کہا گیا ہے۔ یہ عربی زبان کے اسلوب سے ناواقفیت کی وجہ سے سمجھا گیا ہے کیونکہ عربی زبان میں لحم گوشت اور چربی دونوں کے لیے بولا جاتا ہے جبکہ چربی کا اطلاق دونوں پر نہیں ہوتا۔

۲۔ کچھ متکلمین یہ باور کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بھی پہلو ہے کیونکہ قرآن میں وارد ہے:

ان تقول نفس یاحسرتا علی ما فرطت فی جنب اللہ۔ ﴿زمر:۶۰﴾ تاکہ کوئی نفس یہ نہ کہے کہ افسوس، میں نے اللہ کے پہلو میں کوتاہی کی۔

جبکہ یہاں پر پہلو سے مراد اللہ کی جانب یا اس کے حق میں کوتاہی کرنے سے ہے۔ امام رازیؒ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں، ''یہاں پہلو اس وجہ سے کہا گیا کہ وہ بھی ایک کنارے ہوتا ہے۔ کسی چیز کے لوازمات اور توابع بھی اس کے پہلو ہی ہوتے ہیں۔ اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہاں اللہ کے پہلو سے مراد اس کے حق اور اس کی اطاعت ہے۔

۳۔ حضور کی حدیث ہے:

اذا سمعتم الموذن فقولو امثل مایقول ثم صلوا علی. جب تم اذان سنو تو تم بھی وہی کہو جیسا کہ وہ کہتا ہے پھر مجھ پر درود بھیجو۔

جس کا مطلب کچھ لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ مؤذن بھی اذان کے بعد حضورؐ پر درود بھیجے۔ اس میں یہ کہیں نہیں کہا گیا ہے کہ وہ اذان کی کیفیت کے بغیر یعنی زور زور سے دورود پڑھے۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ جیسے عام طور سے پڑھا جاتا ہے اسی طرح سے پڑھا جائے۔

اب کچھ لوگوں نے حدیث کا یہ مفہوم سمجھ لیا کہ حدیث میں درود بھیجنے کا حکم سب مسلمانوں کے لیے ہے اور مؤذن بھی ان میں داخل ہے۔ اسی طرح حضورؐ کا یہ حکم کہ جب تم سنو میں مؤذن بھی شامل ہے کیونکہ وہ اذان کے کلمات خود بھی سنتا ہے۔

یہ چند مثالیں ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عربی زبان سے ناواقفیت، اس کے الفاظ اور تراکیب کی معلومات نہ ہونے کی وجہ سے لوگ بدعت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

ہمارے اسلاف کا اس بات پر اجماع ہے کہ کتاب وسنت کی روشنی میں اجتہاد کرنے اور شرعی نصوص پر بحث کرنے کے لیے عربی زبان سے واقفیت بنیادی شرط ہے۔

ب) جہاں تک سنت سے ناواقفیت کی بات ہے تو وہ مندرجہ ذیل میدانوں میں ہوتی ہے:

۱۔ صحیح احادیث سے ناواقفیت۔

۲۔ قانون سازی میں سنت کی حیثیت کا علم نہ ہونا۔

پہلی وجہ سے وہ اُن احکام کو پس پشت ڈال دیتا ہے جو صحیح احادیث سے ثابت ہیں، جبکہ دوسری وجہ سے وہ صحیح احادیث ہی کو پس پشت ڈال دیتا ہے اور ان احادیث سے قوانین کو اخذ نہیں کرتا۔ جس کی وجہ سے صحیح احادیث کی جگہ ایک بدعت داخل ہو جاتی ہے جس کا اصل شریعت میں دور دور تک پتہ نہیں ہوتا۔

ذرا اس حدیث پر تو غور فرمایئے جس میں اس خطرے سے ان الفاظ کے ساتھ آگاہ کیا گیا ہے۔

"اللہ تعالیٰ لوگوں سے علم کو بیک وقت سلب نہیں کرے گا لیکن وہ سلب کرے

گا علماء کی موت کے ذریعہ یہاں تک کہ جب ایک بھی عالم باقی نہیں رہے گا تو لوگ جاہلوں کو اپنا سربراہ بنالیں گے۔ لوگ ان سے مسائل پوچھیں گے اور وہ بغیر علم کے فتویٰ دیں گے۔ اس طرح وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

اس سلسلہ میں ایک دوسری حدیث کے الفاظ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

''جب اللہ تعالیٰ کسی قوم میں کسی نبی کو مبعوث فرماتا ہے تو اس کی امت میں علماء اور ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اس کی سنت کی محافظت کرتے ہیں اور اس کے حکم کی اتباع کرتے ہیں، پھر ان کے بعد آنے والی نسلوں کے لوگ صرف کہتے ہیں مگر کرتے نہیں اور وہ کام کرتے ہیں جس کے وہ مامور نہیں ہوتے۔ لہٰذا جو ان کے خلاف ہاتھ سے جہاد کرے گا وہ مومن ہے اور جو زبان سے جہاد کرے گا وہ مومن ہے اور جو قلب سے جہاد کرے گا وہ مومن ہے اس کے علاوہ رائی کے ایک دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہے۔

۲۔ اسلامی قانون سازی میں قیاس کی حیثیت سے ناواقفیت کی صورت یہ ہوتی ہے کہ بھی کو معلوم ہے کہ قیاس کا درجہ سنت کے بعد کا ہے مگر کچھ لوگ صحیح سنت کے باوجود قیاس سے کام لیتے ہیں اور پھر اپنے فیصلہ سے رجوع کرنے پر تیار بھی نہیں ہوتے اور اس طرح وہ بدعت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

فقہاء کے قیاسات کا جائزہ لینے سے اس قسم کی مثالیں بکثرت مل جائیں گی۔ اس کی سب سے بڑی مثال سامعین پر قیاس کر کے مؤذن کے لیے بھی درود پڑھنے کو لازمی قرار دینا ہے جبکہ اسے ترک کرنے کی سنت موجود ہے اور اسے قیاس پر بہر حال مقدم رکھنا چاہیے تھا۔ مزید برآں حدیث میں اذا سمعتم کا لفظ بہت ہی صاف طور سے یہ بتاتا ہے کہ یہ حکم مقتدیوں کے لیے ہے کہ وہ اذان کے کلمات دہرائیں اور پھر درود بھیجیں نہ کہ مؤذن کے لیے۔

اسلامی شریعت میں قیاس کے درجے سے ناواقفیت نے کیا کیا گل کھلائے ہیں، اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ متاخرین فقہاء نے عبادات میں بھی قیاس سے کام لیا جس کی وجہ سے وہ دین میں وہ وہ چیزیں لائے جو کسی سنت سے ثابت نہیں اور کسی عمل سے منقول نہیں۔

ان کے بے لگام قیاس کا دائرہ اتنا وسیع ہوا کہ انھوں نے روزہ پر قیاس کرتے ہوئے نماز کے فدیہ کا بھی حکم صادر کر دیا اور پھر صرف سقوط نماز کے جواز پر ہی نہیں رکے بلکہ اس کے لیے طرح طرح کے حیلے بھی گھڑ لیے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نماز کی صرف صورت رہ گئی اس کی نہ روح باقی رہی نہ اثر۔

اس کے علاوہ ایک دوسری عجیب وغریب بدعت بھی ہے جسے بجا طور پر بدعت مرکبہ کہا جا سکتا ہے۔ وہ ہے اصل حکم میں اپنی رائے سے جدت طرازی اور پھر حیلہ اختیار کر کے اس من گھڑت حکم پر عمل کو ساقط کر دینا اور پھر اس بدعت اور حیلہ دونوں کو دین کا حصہ قرار دیتے ہوئے اس کے ذریعہ فرض کو ساقط کرنا اور بندے کو اس کی بجا آوری سے بری کر دینا اور اس پر مزید یہ کہ اسے وہ ثواب بھی دلا دیا جائے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک اور ایمان والے بندوں کے لیے مخصوص کر رکھا ہے۔

جہاں تک بدعت کے دوسرے سبب کا تعلق ہے تو وہ شرعی احکام کے استنباط میں اپنی ذاتی رائے اور خواہش داخل کرنے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اپنی انا اور خواہش کا اسیر یہ شخص پہلے ایک حکم کو ثابت کرتا ہے پھر اسے استوار کرنے کے لیے کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا جمع کرتا ہے۔ دراصل ایسا شخص اس مسئلے کی پوری عمارت اپنی ذاتی خواہش پر کھڑی کرتا ہے اور پھر اسے طرح طرح کی دلیلوں سے ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے جس کی وجہ سے مسئلہ کی ہی قلب ماہیت ہو جاتی ہے۔ جبکہ اصل یہ ہے کہ دلیلوں سے احکام کا استنباط کیا جائے نہ یہ کہ احکام پہلے وضع کر دیے جائیں اور پھر ان کے لیے دلیلیں گھڑی جائیں۔

دراصل شرعی مسائل میں ذاتی خواہش کی پیروی ہی سیدھے راستے سے انحراف کی وجہ ہے۔ خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ومن اضل ممن تبع هواه بغير هدى من الله ﴿قصص: ٥٠﴾

اس شخص سے گمراہ اور کون ہوگا جس نے اپنی خواہش کی پیروی کی اللہ کی ہدایت کے بغیر۔

اور صحیح حدیث میں وارد ہے:

لايؤمن احدكم حتى يكون هواه تبعا لما جئت به.

تم میں سے کوئی شخص بھی ایمان والا نہیں ہوگا جب تک کہ اس کی خواہش میری لائی ہوئی چیزوں کے تابع نہ ہو۔

اس طرح کی بدعت کے شکار عام طور سے بادشاہوں اور رئیسوں کے حاشیہ نشین لوگ ہوتے ہیں، جن کا واحد مطمح نظر دنیاوی مال وجاہ کا حصول ہوتا ہے۔

دراصل مکروفریب کے ذریعہ دین کی طرف منسوب تمام خرافات، جبکہ دین اس سے قطعی طور سے بری تھا، کے پس منظر میں یہی خوشامد پسند لوگ رہے ہیں۔ اذان سلطانی جس کا مشاہدہ اکثر ملوک وسلاطین کی نمازوں میں کیا جا سکتا ہے، کچھ راتوں میں دینی اجتماع وغیرہ وغیرہ یا تو بادشاہ سلامت کی اپنی خواہش یا کسی مقرب شخص کی صلاح کا نتیجہ ہوتا ہے۔

پھر یہ سلسلہ نسل درنسل چلتا رہا، یہاں تک کہ یہ عوام میں پھیل گیا اور پھر لوگ اسے دین کا ایک شعار سمجھنے لگے اور اس پر نکیر کرنے والا شخص ان کی تنقیدوں اور عتاب کا نشانہ بن گیا۔

درحقیقت خواہشات کی اتباع دین کے لیے زہر قاتل ہوتی ہے اور وہ دین سے خیر کو ختم کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بدعت گناہ کے اعتبار سے شدید ترین اور دین کے خلاف سب سے بڑا جرم ہوتی ہے۔ کتنی شریعتوں میں اس نفسانی خواہش کی وجہ سے تحریف کی گئی۔ کتنے دین بدل ڈالے گئے اور نہ جانے کتنے لوگ کھلی ہوئی گمراہی کا شکار ہو گئے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس طرح کی نفسانی خواہشات کے شکار بدعتی لوگوں ہی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

''اور نہ بیچو آیات کو تھوڑی سی قیمت میں، اور مجھی سے ڈرو، اور حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو، اور تم جانتے بوجھتے حق بات کو نہ چھپاؤ'' (بقرہ:۴۱-۴۲)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

''بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں وہ چیز جسے اللہ نے کتاب میں نازل کیا ہے اور بیچتے ہیں اسے تھوڑی قیمت میں، وہ لوگ اپنے پیٹوں میں صرف آگ ہی کھا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اُن سے بات نہیں کرے گا اور نہ ہی انھیں پاک صاف کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ ان لوگوں نے گمراہی کو ہدایت کے بدلے میں اور عذاب کو مغفرت کے بدلے میں خرید لیا ہے۔ یہ لوگ آگ پر کس قدر

صبر کر رہے ہیں، کیونکہ اللہ نے کتاب کو برحق نازل کیا ہے اور جن لوگوں نے کتاب میں اختلاف کیا ہے وہ سخت جھگڑے میں ہیں'' (بقرہ:۲-۱۷۴-۱۷۶)

جہاں تک بدعت کے تیسرے پہلو کا تعلق ہے اور وہ ہے شرعی مسائل میں اپنی عقل کے گھوڑے دوڑانا تو انسانی عقل صرف ایک حد تک ہی ادراک کر سکتی ہے کیونکہ وہ ہر شے کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ کچھ چیزوں کی تہہ تک عقل پہنچ ہی نہیں سکتی جبکہ کچھ چیزوں میں صرف ظاہری حد تک پہنچ سکتی ہے حقیقت تک نہیں۔ اسی لیے ایک مخبر صادق کی طرف رجوع کرنا ضروری ہوتا ہے جس کے معجزات کو دیکھ کے عقل بھی اس کی تصدیق کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ یہ مخبر صادق رسول کریم کی ذات ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ عالم الغیب والشہادۃ کی پوری پوری تائید حاصل ہوتی ہے۔

اسی مقصد کے پیش نظر اللہ تعالیٰ رسول بھیجتا ہے جو لوگوں کو وہ عمل بتاتے ہیں، جن سے خدا راضی ہوتا ہے اور جن سے دنیا و آخرت دونوں جگہ سرخروئی نصیب ہوتی ہے۔

لیکن افسوس کہ کچھ لوگوں نے اپنے عقلی گھوڑے اُن میدانوں میں بھی دوڑا دیے جن میں انھیں نہیں دوڑانا چاہیے تھا۔ انھوں نے صرف اس بات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انھوں نے اسے اللہ کے بندوں پر اللہ کی حجت قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ کے فرمودات جن میں انسانی عقل کی رسائی نہیں ہو سکتی اس میں انھوں نے عقلی بنیاد پر قانون سازی کی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو فرمودات ان کی عقل سے ماوراء تھے اس کا انھوں نے انکار کیا۔ پھر اس کا دائرہ مزید وسیع کر کے شریعت الٰہیہ میں عقل کو اصل قرار دے کر ان تمام چیزوں کو حلال قرار دیا جن کو اللہ نے حلال نہیں کیا تھا اور ان چیزوں کو بھی جائز قرار دے دیا جن کے بارے میں ہمیں معلوم نہیں کہ اللہ ان سے راضی بھی ہوگا۔

درحقیقت جب انھوں نے علماء امت کے بیان کردہ شرعی احکام کے اسرار و رموز اور ان میں مخفی حکمتوں پر نظر ڈالی تو انھوں نے ان اسرار و رموز ہی کو مقصود بالذات سمجھ لیا اور یہ سمجھ بیٹھے کہ یہی اسرار و رموز ان احکام کے مقاصد ہیں۔ چنانچہ انھوں نے ان اسرار و رموز کے حصول کے لیے انہی جیسی دوسری عبادات کا اختراع کر ڈالا اور یہی چیز پھر بہت ساری بدعات کی ایجاد کی جڑ بن گئی۔

یہی عقل نارسا بہت ساری غیبی چیزوں کے انکار کا باعث بن گئی۔ حالانکہ یہ چیزیں صحیح احادیث سے ثابت ہیں، جیسے پل صراط، میزان، انہی جسموں کے ساتھ حشر، عالم برزخ میں جسمانی عذاب وثواب اور پھر قیامت کو خدا کا دیدار وغیرہ جو اگرچہ عقل سے ماوراء چیزیں ہیں، مگر صحیح احادیث وغیرہ سے ثابت ہیں۔

یہی عقل ناقص بہت سے ثابت شدہ شرعی احکام کو چھوڑ کر خود ساختہ احکام کو اختیار کرتی ہے کیونکہ اس کی نظر میں اس سے کہیں بہتر طور سے وہ مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اسی عقل ناقص کے بل بوتے پر انھوں نے بہت ساری عبادات اور وظائف بنا ڈالے اور صرف اس گمان میں کہ ان عبادات اور وظائف کے سہارے اللہ تعالیٰ کا زیادہ سے زیادہ تقرب حاصل کیا جا سکتا ہے۔

کبھی کبھی بدعت کی ایجاد کے پیچھے دفع منکر کا نیک جذبہ کارفرما ہوتا ہے اور چونکہ اس کے گمان میں یہ ہوتا ہے کہ یہ نئی چیز جو شرعاً جائز ہے اس کو اختیار کر کے ایک خرابی سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔

مثال کے طور پر مسجد میں بلند آواز سے قرآن کی تلاوت ہے یا جنازوں کے آگے دعاؤں کا زور زور سے پڑھنا ہے، تا کہ لوگ مساجد میں اور جنازوں میں شرکت کے وقت دنیا کی باتیں نہ کریں۔

بدعت کی ایک قسم بزعم خود نفس کو زیادہ سے زیادہ مشقت میں ڈال کے زیادہ سے زیادہ ثواب حاصل کرنا ہے۔ یہ بدعت دو طرح سے کی جاتی ہے۔

پہلی قسم یہ ہے کہ ایک غیر مشروع چیز کو مشروع چیز میں ملا دینا، یہ سمجھتے ہوئے کہ شریعت کا عین مقصد یہی ہے۔

مثال کے طور پر بغیر سحری کے روزہ رکھنا کیونکہ اس سے روزہ کا اصل مقصد خواہشات نفسانی کا سد باب کہیں زیادہ بڑھ سکتا ہے۔

اسی طرح اپنے اوپر تمام زیب وزینت کو حرام قرار دے دینا، جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر حرام قرار نہیں دیا ہے، کیونکہ اس طرح سونا اور ریشم وغیرہ کی حرمت کے مقصد کو بدرجہا بہتر طور سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح روایات میں تعارض کے وقت مشکل ترین امر کو اختیار کرنا اس حقیقت کے باوجود کہ حضورؐ ہمیشہ آسان ترین امر کو اختیار فرماتے تھے۔

اسی طرح حضورؐ کے تمام افعال کو عبادت سمجھ کے کرنا جبکہ آپؐ کے بہت سے افعال صرف عادتاً تھے۔ ان میں عبادت کا کوئی بھی پہلو مقصود نہیں تھا۔

بدعت کی دوسری قسم ہے پر مشقت عبادات اختیار کرنا جن کو کرنے کے لیے شریعت نے کوئی حکم نہیں دیا۔ مثال کے طور پر مسلسل روزے رکھنا، رات دن عبادت کرنا، گوشہ نشینی اختیار کرنا اور شادی بیاہ سے دوری نیز سنتوں اور مستحبات پر فرائض کی طرح عمل کرنا۔

مذکورہ بالا تمام امور سے خود حضورؐ نے منع فرمایا ہے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے، ''کچھ لوگوں کو کیا ہوا ہے جو ایسی چیزوں سے پرہیز کر رہے ہیں جنھیں میں کر رہا ہوں، اللہ کی قسم میں اللہ کو ان سے زیادہ جانتا ہوں اور ان سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں''۔

ایک دوسری حدیث میں وارد ہے:

لن یشاد الدین احد الا غلبه. دین میں کوئی شدت ہرگز نہ کرے کیونکہ دین ہی غالب ہوگا۔

اسی طرح حضورؐ کا ارشاد ہے:

لا تشددوا علی انفسکم فیشدد الله علیکم. تم لوگ اپنے اوپر سختی نہ کرو کیونکہ پھر اللہ تعالیٰ تم پر سختی کرے گا۔

حضور نے حضرت ابن عمرؓ پر نکیر فرمائی تھی اور ان دیگر لوگوں پر بھی نکیر فرمائی تھی جنھوں نے حضور کی عبادت کو کم سمجھتے ہوئے اور زیادہ عبادات کی خواہش کی تھی۔

افسوس تو یہ ہے کہ آج بہت سے لوگوں نے حضور کی ان تنبیہات کو نظر انداز کر کے طرح طرح کی پر مشقت عبادات اور وظیفے گھڑ لیے ہیں۔ خود بھی ان پر عمل پیرا ہیں اور اپنے متبعین کو بھی ان پر عمل پیرا کر رہے ہیں۔ وہ اپنے متبعین کو یہ باور کرا رہے ہیں کہ یہی دین ہے اور یہی اصلی عبادت ہے۔ وہ اس حقیقت کو فراموش کر بیٹھے ہیں کہ اللہ کا تقرب اس کی شریعت کی پابندی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ وہ اس بات کو بھی بھول گئے کہ اللہ کا تقرب صرف سنت رسول کی اتباع کر کے ہی حاصل کیا جا سکتا

ہے خود ساختہ طریقوں سے نہیں۔ اس طرح وہ بدعت اور سنت کی مخالفت کے جرم میں مبتلا ہو کر نہ صرف یہ کہ اپنے مشقت بھرے عمل کے ثواب سے محروم ہو گئے بلکہ الٹے گنہگاروں کی صف میں بھی داخل ہو گئے۔

ہم نے مذکورہ بالا صفحات میں بدعت کی جتنی بھی قسمیں بیان کی ہیں ان تمام چیزوں کو اس حدیث نے سمیٹ لیا ہے:

يحمل هذا العلم فى كل خلف عدوله ينفرن عنه تحريف الغالين و انتحال المبطلين و تاويل الجاهلين.	اس علم کو ہر آنے والی نسل میں دیانتدار و معتبر لوگ اٹھائیں گے جو اس سے غلو پسندوں کی تحریف، باطل پسندوں کے انحراف اور جاہلوں کی تاویل کو دفع کریں گے۔

اس طرح اس حدیث میں غالین سے مراد غلو اور تشدد پسند ہیں جبکہ مبطلین سے مراد شرعی امور میں عقل اور خواہش کے استعمال کرنے والے ہیں اور جاہلین سے مراد احکام کے ماخذ اور ان کے اسلوب سے ناواقف کار ہیں۔

مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں ہر مومن کو بدعت، اس کے مضمرات اور اس کے گناہ وغیرہ کے بارے میں اچھی خاصی جان کاری ہو گئی ہوگی لہٰذا ہر مسلمان کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اس گناہِ عظیم سے پرہیز کرے۔

☆☆☆

باب۔۲

بدعاتِ عقائد

توحید اسلام کا جوہر ہے، اسلام کی روح ہے، اسلام کا مظہر ہے، اسلام کا گوشت پوست ہے اور اسلام کی پوری عمارت کا ستون ہے۔

اسلام اس دنیا کا پہلا مذہب نہیں ہے جس نے لوگوں کو توحید کی دعوت دی۔ اللہ کے فرستادہ تمام رسولوں نے لوگوں کو ایمان خالص کی طرف بلایا، ایک خدا کی پرستش پر لوگوں کو جمع کیا۔ خدا کی اس توحید میں شرک کی ہلکی سی آمیزش سے بھی دور رہنے کا مشورہ دیا۔ خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وما ارسلنا من قبلك من رسول الا نوحی الیه انه لا اله الا انا فاعبدون ﴿الانبیاء:۲۵﴾	اور تم سے قبل ہم نے جتنے بھی رسول بھیجے ہیں ان کی طرف وحی بھیجتے ہیں کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں لہٰذا تم لوگ میری عبادت کرو۔

لیکن عوام کی ایک بہت بڑی اکثریت نے انبیاء کرام کے بتائے ہوئے اس سیدھے راستے کو چھوڑ کر اوہام وخرافات کو حرز جاں بنالیا جس کی وجہ سے وہ اللہ سے دور ہو گئے اور اپنے لیے تباہی کو دعوت دی۔

تمام انبیاء کرام حق کا پیغام لے کر آئے اور لوگوں کو حق کی طرف دعوت دی، یہاں تک کہ آخری نبی حضرت محمدؐ بن عبداللہ اس دنیا میں اس مشن کی تکمیل کے لیے تشریف لائے۔

نبی آخرالزماںؐ نے شرک کے مضبوط قلعہ کو منہدم کر کے لوگوں کے دلوں کو خدائے واحد و برتر پر ایمان سے منور کر دیا۔

قرآن شریف رسولؐ اللہ کے زمانے میں اور آج بھی اس توحید خالص کا نقیب بنا رہا اور عقیدۂ توحید میں شرک کے ہلکے سے شائبہ یا آمیزش کے خلاف نبرد

آزمارہا۔

لیکن افسوس صد افسوس! پچھلی امتوں کی بیماریوں نے مسلمانوں کو بھی آدبوچا۔انھوں نے خالص توحید میں توہمات، بدعات اور خرافات کی آمیزش کرنی شروع کردی۔

آج ملت اسلامیہ صراط مستقیم سے بالکل اسی طرح پھسل کے دور جارہی ہے جس طرح پچھلی امتیں پھسلی تھیں۔آج یہ ملت بھی بدعات، خرافات اور لغویات میں پھنس کر رہ گئی ہے۔سچ فرمایا تھا اللہ کے رسولؐ نے تم پچھلی امتوں کے نقش قدم پر چلو گے قدم بہ قدم۔

خداتعالیٰ کا قول ہے:

كذلك قال الذين من قبلهم مثل قولهم تشابهت قلوبهم قدبينا الآيات لقوم يوقنون ﴿البقرة:۱۱۸﴾

اسی طرح کی بات پچھلے لوگوں نے بھی کہی تھی، ان کے دل ایک جیسے ہو گئے ہیں، ہم نے یقین رکھنے والے لوگوں کے لیے آیات بیان کردی ہیں۔

بدعت جب کسی قوم میں داخل ہوتی ہے تو اس کا پہلا نشانہ عقیدۂ توحید بنتا ہے تاکہ وہ اس مضبوط قلعہ میں شگاف ڈال سکے۔

مخلوق کو خالق کی صف میں لا کے کھڑا کر دینا شرک ہے جو توحید کے عقیدہ کو ملیامیٹ کر دیتا ہے۔اسی طرح مخلوق کا خالق میں جذب ہو جانا ایسی گمراہی ہے جس کی اس ملت میں کوئی بنیاد نہیں ہے۔اگرچہ بظاہر یہ چیزیں اللہ کی جلالت وعظمت میں غلو اور اصل توحید میں اپنے آپ کو غرق کر دینا نظر آئیں۔اسی طرح کا ایک مسئلہ وحدۃ الوجود کا بھی رونما ہوا تھا۔

وحدۃ الوجود

ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ غلو پسند قدیم صوفیاء کے ساتھ ہی یہ عقیدہ بھی رخصت ہو گیا۔مگر ایسی بات نہیں ہے۔

ہمارے زمانے میں بھی جب کچھ مسلمان اپنی سابقہ گناہوں کی دنیا چھوڑ کے

اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں تو وہ عجیب وغریب خرافات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی توبہ کی تکمیل یا قبولیت اسی وقت ہو سکتی ہے جب وہ اپنے سامنے آنے والی ہر شے یا شخص میں خدا کی جلوہ نمائی دیکھیں۔

آپ ایسے لوگوں کو دیکھیں گے کہ وہ اپنے وجود سے یا اپنے آپ سے باہر نکل آتے ہیں اور پھر لوگوں کو قدیم عقیدہ سے باہر نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے لوگ ''حلاج'' کا یہ قول بار بار نقل کرتے ہیں کہ جب ان سے پوچھا گیا کہ جبہ میں کون ہے تو انھوں نے کہا اللہ ہے۔

چونکہ اس نظریہ پر سلوک کی عملی عمارت کھڑی نہیں کی جا سکتی اس لیے اس نظریہ کے علم بردار انسانی ارادہ میں جبر کا نظریہ پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انسان تو اپنے اردگرد پیش آنے والے حادثات کا تابع ہے۔ اس کے بعد وہ جھوٹی حدیث پیش کرتے ہیں جس کی رو سے اللہ ہر چیز میں پنہاں ہے۔

افسوس تو اس بات کا ہے کہ اس قسم کی بیہودہ خرافات کو مسلمانوں کے ایک بڑی تعداد نے سچ سمجھ لیا جس کا منفی اثر یہ پڑا کہ بلاد اسلامیہ میں مادی ترقیات ٹھپ ہو گئیں اور الٰہیات کے ساتھ ایسی چیزیں خلط ملط ہو گئیں جن کا نہ تو کوئی سر تھا اور نہ پیر۔

مخلوق ایک الگ چیز ہے جس کا خالق اللہ بالکل الگ ہے۔ دونوں کا وجود قطعی جداگانہ ہے۔ پھر یہ صوفیاء حضرات کہاں سے دور کی کوڑی لائے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اس کے نام ہیں اور پھر اس کے حقوق ہیں جن کی تمام تر تفصیلات اس کی نازل کردہ کتاب میں موجود ہیں۔

اس کے علاوہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود میں بھی بہت بڑا فرق ہے۔ کبھی کبھی انسان کسی مسئلہ پر غور وفکر میں اس قدر غرق ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے گردوپیش سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی اس کی دماغی محویت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ وہ بلانے کی آواز کو بھی سن نہیں پاتا۔

کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اب اس کا انحصار صرف اس کی اپنی ذات پر ہے اور اس کے اردگرد کی تمام چیزیں معدوم ہو گئی ہیں، محض اس وجہ سے کہ اس وقت یہ

چیزیں اس کے دل ودماغ سے غائب ہیں؟

سورج جب نکلتا ہے تو اس کی کرنیں پوری کائنات کو ڈھانپ لیتی ہیں۔ آپ کو پورے آسمان پر دور یا قریب کوئی ستارہ نظر نہیں آئے گا۔ لیکن رات کی تاریکی پھیلتے ہی یہ چھپے ہوئے ستارے الگ الگ یا جماعتوں کی شکل میں پھر چمکنے لگتے ہیں۔

پھر کیا سورج کی کرنوں کا یہ غلبہ اس بات کی علامت سمجھا جاتا ہے کہ ستاروں کا وجود ہی ختم ہو چکا ہے؟

اللہ کے نیک بندے اللہ کے نور کے زیر سایہ خوشگوار زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ مقام احسان پر فائز ہو کر اس طرح کی زندگی کے خوگر ہو جاتے ہیں۔

مقام احسان کیا ہے؟ اس کی تعریف خود حضورؐ نے اس طرح کی ہے، ''تم اللہ کی اس طرح عبادت کرو گویا اسے دیکھ رہے ہو، اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو تمہیں دیکھ ہی رہا ہے۔

اس عادت کو ہم صحیح معنوں میں وحدۃ الشہود کا نام دے سکتے ہیں، یہ خدا کا انعام ہے جو ہر طرح سے وحدۃ الوجود سے الگ چیز ہے۔ کوتاہ بینوں نے ان دونوں چیزوں کو باہم خلط ملط کر دیا۔

کچھ لوگوں پر جب کوئی خاص زاویۂ فکر غالب آتا ہے یا ان پر جب کوئی خاص جذبہ حاوی ہو جاتا ہے تو وہ دنیا کی تمام چیزوں کو اسی زاویۂ نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں۔

اسی طرح کچھ لوگوں پر جب دینی جذبہ غالب آجاتا ہے تو ان کی تمام سرگرمیوں کا مرکز صرف رضاء الٰہی رہ جاتا ہے اور کچھ نہیں اور پھر وہ ہر چیز کو صرف اسی نقطۂ نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔

اسی ضمن میں حضورؐ کی طرف منسوب اس حدیث کو بھی پیش کیا جاتا ہے۔

''جس نے میرے ولی سے دشمنی کی میں اس کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہوں''۔

ایک دوسری حدیث ہے:

وما تقرب الی عبدی بشئ احب الی مماافترضت علیه وما یزال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتی احبه فاذا	مجھے سب سے زیادہ یہ بات پسند ہے کہ بندہ فرائض کی ادائگی کے ذریعہ میری قربت حاصل کرے اور پھر بندہ نوافل کے ذریعہ میرا تقرب حاصل کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اس سے

اجبته کنت سمعه الذی یسمع به وبصره الذی یبصربه ویده التی یبطش بهاورجله التی یمشی بهاولئن سألنی لاعطنیه ولئن استعاذنی لاعیذنه.

محبت کرنے لگتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو اس کا کان بن جاتا ہوں، جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے، اگر وہ مجھ سے کچھ مانگتا ہے تو میں اسے عطا کرتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے پناہ طلب کرتا ہے تو میں اسے پناہ دیتا ہوں۔

اس حدیث کا سیدھا سا مطلب ہے اللہ کی رضا میں خود کو اس طرح فنا کر دینا کہ اس کے تمام حواس اور اعضاء اللہ اور صرف اللہ کی اطاعت کے لیے مسخر ہو جائیں، لیکن اس حدیث کا یہ مطلب ہرگز ہرگز نہیں ہے کہ عبادت میں فنا ہو جانے سے ذات باری کا اس میں حلول ہو جاتا ہے یا خالق و مخلوق ایک ہو جاتے ہیں، جیسا کہ بہت سے سادہ لوح حضرات سمجھتے ہیں یا ایسے لوگوں سے خلاف عادت چیزوں کا ظہور ہونے لگتا ہے جیسا کہ بہت سے صوفیاء حضرات سمجھتے ہیں۔ اس کے لیے وہ ایک جھوٹی اور سراسر من گھڑت حدیث کا سہارا لیتے ہیں جس میں یہ کہا گیا ہے:

عبدی اطعنی اجعلك ربانیا تقول للشئی کن فیکون.

میرے بندے میری اطاعت کر میں تمکو ربانی بنا دوں گا تم کسی شے کے لیے ہو جا کہو گے تو وہ شے ہو جائے گی۔

اللہ اور بندوں کے درمیان واسطے

اس برائی میں زیادہ تر عوام مبتلا ہیں۔ وہ بزرگان دین کے مزارات پر حاضری دیتے ہیں اور پھر صاحب مزار سے وہ چیزیں مانگتے ہیں جو صرف خدائے بزرگ و برتر سے مانگنی چاہیے۔

ایسا وہ صرف اس لیے کرتے ہیں کہ خود کو اس قدر حقیر اور کم تر سمجھتے ہیں کہ وہ خدا سے براہ راست مانگتے ہوئے شرماتے ہیں۔ گناہ اور کمتری کے اسی احساس کے پیش نظر وہ اپنی ضرورتوں کو جنھیں وہ خود اپنی زبان اور دل سے کہتے ہوئے شرماتے ہیں خدا کے دربار میں پیش کرنے کے لیے ان اولیاء اللہ کا سہارا لیتے ہیں۔

درحقیقت یہی وہ اصل بیماری ہے جس کی وجہ سے اللہ کے زندہ بندے اللہ کے ان مردہ بندوں کے حضور میں جا پہنچتے ہیں، جو نہ سن سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں۔

کتنی چیزیں ایسی ہیں جو بظاہر اللہ کی قدرومنزلت بڑھانے اور رفع شان کے لیے کی جاتی ہیں مگر اس کے لیے اللہ کی محرمات کو پامال کیا جاتا ہے؟

کیا آپ کو معلوم ہے کہ مشرکین مکہ مرد اور عورتیں دونوں خانہ کعبہ کا طواف ننگے کرتے تھے اور دلیل یہ دیتے تھے کہ جن کپڑوں میں ہم نے گناہ کیا ہے انھیں کو پہن کے طواف کیسے کریں؟

قدیم بت پرستی کا نظریہ یہی تھا کہ بغیر کسی وسیلہ یا واسطہ کے اللہ تک کیسے رسائی ہو سکتی ہے؟ قرآن کریم نے اس صورت حال کی تصویر کشی اس طرح کی ہے:

ما نعبدهم الا ليقربونا الى الله زلفى۔ ﴿زمر:۳﴾ ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ سے قریب پہنچادیں۔

اس عذر لنگ کا سہارا موجودہ جہالت کے علم بردار بھی لیتے ہیں۔ قبروں یا مزاروں پر حاضری دینے والے بیماری سے شفا، کامیابی، مدد و نصرت کی طلب کے لیے اسی دلیل کو پیش کرتے ہیں۔

یہ بات بہت ہی واضح ہے کہ اسلام خدا اور بندے کے درمیان کوئی واسطہ نہیں مانتا۔ ہر مسلمان خواہ وہ کیسا بھی ہو اس بات کا مامور ہے کہ وہ اللہ کے حضور کھڑا ہو کے دست بدعا ہو جائے، اس یقین و اعتماد کے ساتھ کہ اسکی دعا خدا تعالیٰ براہ راست سن رہا ہے، کسی دوسرے انسان کے واسطہ کے بغیر، خواہ وہ کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو۔

اسلام کی پہلی عبادت نماز ہے جسے دن ورات کے مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے، نماز کی اصل حقیقت بھی خدا اور بندے کے درمیان براہ راست رشتہ قائم کرنا ہے۔

اب آپ ہی دیکھئے کس طرح اللہ نے اپنے بندوں پر یہ فرض عائد کیا ہے کہ وہ اس کے دربار میں بار بار آئیں اور اس سے صراط مستقیم پر چلنے کی ہدایت طلب کریں اور اس کے سامنے دست سوال دراز کرتے ہوئے عاجزی کے ساتھ سجدہ کریں۔

پھر ان نمازوں کو چھوڑنے کو کس طرح کفر قرار دیا گیا ہے یا اسے حقوق اللہ کے تئیں غفلت قرار دیا گیا ہے۔ ان حالات میں کوئی شخص یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ اسے

اپنی درخواست اللہ تک پہنچانے کے واسطے کسی واسطہ کی حاجت ہے۔

اس کا سبب اس کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ انسان کو شرک خفی یا شرک جلی میں دلچسپی ہے۔

اور پھر آپ اس واسطہ کے طلب گار سے بھی تو پوچھئے کہ وہ اللہ سے کلام کرنے کے لیے کسے پسند کرے گا؟

اگر وہ کسی خدا کے نیک مگر زندہ بندے کا دامن پکڑ کے خدا سے دعا کی درخواست کرتا تب بھی مسئلہ آسان ہوتا۔

مگر تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اس کام کے لیے اس نے فوت شدہ اولیاء کا دامن پکڑا ہے جن کا اب اس دنیا سے کوئی واسطہ ہی نہیں رہ گیا اور اب وہ اپنے عمل کی مکافات کے لیے خود خدا کے سامنے پیش ہیں۔

اور اب تو وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ کوئی جاہل مطلق شخص ان کے پاس آیا ہے اور کیونکر آیا ہے؟ تاکہ ان سے وہ کچھ مانگے یا ان کی شفاعت و وساطت طلب کرے؟

اسلامی فکر ایک طویل مدت سے اس تاریک کھائی میں اسیر ہو کے رہ گئی ہے، بزرگی، کرامت اور اولیاء اللہ کو لے کر اس امت میں طرح طرح کی خرافات کی بھرمار ہوگئی ہے۔

اس امت میں جہالت و گمراہی کے ایسے دن بھی آئے ہیں جن میں کچھ افراد نے یہاں تک سمجھ لیا کہ اس پوری کائنات کا نظام اولیاء اللہ اور بزرگان دین کی روحیں چلاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ وہی کرتے ہیں جیسا یہ چاہتی ہیں۔

مزید ستم یہ کہ ان اولیاء اللہ سے منسوب کرامات اور خوارقِ عادات کو اسباب اور قوانین فطرت سے بھی ماورا کر دیا گیا۔

ان سب باتوں کا ایک بہت ہی خراب نتیجہ یہ نکلا کہ خدا کے قوانین فطرت کے بارے میں مسلمانوں کے انداز فکر میں انتشار پیدا ہوگیا اور انھوں نے یہ باور کرلیا کہ غیر معمولی ریاضت و عبادت سے اشیاء کی فطرت و طبیعت کو بھی بدلا جا سکتا ہے۔

اس منفی انداز فکر کا منطقی انجام یہ ہوا کہ اس کائنات بر و بحر کے راز ہا سربستہ سے متعلق تحقیق و جستجو میں حاصل اعلیٰ مقام مسلمانوں کو حاصل نہ رہا۔

اس طرح اس امت مرحومہ نے ایک طرف دنیاوی سیادت کھودی تو دوسری طرف اخروی سعادت بھی ہاتھ سے جاتی رہی کیونکہ اس نے اللہ کے ساتھ اُن ہستیوں کوشریک کرلیا تھا جو نہ تو خود کو نفع نقصان پہنچانے پر قادر تھے اور نہ ہی کسی غیر کو۔

ذرا خدا کے اس فرمان پر تو نظر ڈالیے:

افحسب الذین کفروا أن یتخذوا عبادی من دونی اولیاء انا اعتدنا جہنم للکافرین نزلا ﴿کہف:۱۰۲﴾

کیا کفار یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے میرے علاوہ میرے بندوں کو دوست بنا لیا ہے، ہم نے کافروں کے لیے جہنم میں مہمان داری کا انتظام کررکھا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ملت اسلامیہ نے اس بات کو کیسے گوارہ کرلیا کہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی شخص، خواہ وہ کتنا عظیم ہی کیوں نہ ہو، واسطہ بن سکتا ہے؟

اور پھر یہ کیسے باور کرلیا گیا کہ کچھ لوگ قانون فطرت کے علی الرغم کرامات اور خوارق عادت چیزوں کا مظاہرہ کرسکتے ہیں؟

اور پھر اللہ، اس کے رسولؐ اور آخرت پر ایمان کے ساتھ ہی ساتھ ان اولیاء اللہ کو تکوینی امور میں متصرف ہونے کے حقوق اور قدرت کس طرح عطا کردی گئی؟

حق وانصاف کی بات یہ ہے کہ سادہ لوحی سے مختلف چیزوں کو باہم خلط ملط کر دیا گیا ہے اور وہ بھی اسلام سے قبل دور جاہلیت والے جذبہ کے ساتھ۔

اولیاء پرستی کے علم بردار لوگ یہ سمجھتے ہیں اور دوسروں کو بھی سمجھاتے ہیں کہ مزارات کے ساتھ وابستہ ان کی عقیدت اسلامی تعلیمات کے منافی نہیں ہے۔ حالانکہ یہ بات خالص توحید کو، جو اسلام کی روح ہے، آلودہ بنادیتی ہے۔

ان حضرات کی پیش کردہ دلیلوں پر حیرت بھی نہیں ہونی چاہیے کیونکہ عیسائی تو تثلیث میں بھی توحید کا پہلو ڈھونڈھ لیتے ہیں اور پھر خدا تعالیٰ کا بھی فرمان ہے:

وکان الانسان اکثر شئی جدلا ﴿کہف:۵۴﴾

یہ انسان سب سے زیادہ جھگڑالو ہے۔

مادہ سے ماورا دنیا

اسلام رشد وہدایت کا مذہب ہے۔ پہلے اپنے آپ کو بنایئے سنواریے پھر

پوری سوسائٹی کو سنوار ہے۔ جب قرآن شریف نازل ہوا اور حضورؐ نے لوگوں کو واضح حق پر جمع کرنا شروع کیا تو لوگوں نے دو چیزوں کو بیک وقت لازم پکڑ لیا۔

مسلمانوں نے سب سے پہلے خود کو دینی سانچے میں ڈھالا اور پھر پوری دنیا کو بہ رضا و رغبت حق اور خیر کی راہ دکھائی۔

اس عظیم مشن اور اس کے مذکورہ بالا دونوں عظیم پہلوؤں کی ذمہ داریوں نے بے کاری بے راہ روی اور ذہنی عیاشی سے مسلمانوں کو دور رکھا۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے سلف صالح کی پوری تاریخ میں کوئی بھی ایسا واقعہ نظر نہیں آتا جو اس بات کا غماز ہو کہ انھوں نے مادہ سے ماوراالہیاتی مسائل میں بحث کی ہو یا دین کے تسلیم شدہ اصولوں میں موشگافیاں کی ہوں۔

کیونکہ پوری اسلامی قوم اس سے کہیں زیادہ اہم باتوں میں مشغول تھی۔ وہ اسلام کے حقیقی مشن کی تکمیل میں لگے ہوئے تھے۔

ان کی سرگرمیوں کا اول و آخر مقصد یہی عظیم کام اور اس سے برآمد نتائج تھے۔

پھر جب اس عظیم مشن سے وابستہ جذبہ میں سست گامی پیدا ہوئی اور لوگ اپنی مجلسوں میں سکون سے بیٹھنے لگے تو انھوں نے اپنی توجہ کا مرکز اسلام کے اصول و فروع اور اس کی مبادیات کی تفسیر و تشریح کو بنالیا۔ یہ کام وہ اللہ کی عبادت اور اس کا تقرب حاصل کرنے کی نیت سے کر رہے تھے۔ اس بات کو آپ اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ اپنی فراغت کے شب و روز اس طرح گذارا کرتے تھے۔

لیکن بعد میں اسی ذہنی عیش پرستی نے اسلام پر شر کے دروازوں کو کھول دیا۔ خاص طور سے جب یونانی فلسفہ کا عربی میں ترجمہ ہوا اور مسلمانوں نے اپنی گم شدہ متاع سمجھ کر اسے ہاتھوں ہاتھ لے لیا۔

اس کا برا نتیجہ نکلا کہ بہت سے مفکرین نے اسلامی اصولوں کو الہیات کے بارے میں یونان کے پیچیدہ افکار و خیالات سے خلط ملط کر دیا۔

اور پھر بیجا مناقشات، بے سر پیر کے مباحث کا ایک بہت ہی وسیع و عریض میدان مل گیا۔ اسلامی عقیدہ سے وابستہ موضوعات کا نام علم کلام رکھا گیا اور اس طرح علم کی ایک نئی شاخ پیدا ہوئی۔

اسلام کے ممتاز علماء اب اس قسم کے مباحث میں مبتلا ہو گئے:

-کیا وجود عین موجود ہے یا اس کی ایک خارجی صفت ہے؟

-کیا معانی کی صفات یہی ذات ہے یا نہ ذات ہے اور نہ ہی اس کے علاوہ کچھ اور؟

-قرآن اللہ کا کلام قدیم ہے یا حادث؟

-اللہ کا دیدار ممکن ہے یا محال؟

-حشر کے دن یہی جسم ہو گا یا اس کے مشابہ دوسرا جسم

اور پھر

سوالات کا ایک لامتناہی سلسلہ

ان تمام سوالات کے صحیح صحیح جوابات دینے کے بجائے ہم اس بات پر زور دینا چاہیں گے کہ یہ ساری بحث ہی فضول اور لغو ہے، مسلمان ان فضولیات میں اس وقت مبتلا ہوئے جب ان کی شرعی سیاست میں انتشار بپا تھا اور ان کی دلچسپی دنیا میں اس سے کہیں زیادہ نفع بخش امور میں کم ہو گئی تھی۔

کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ علمی موشگافیاں ممنوع ہیں، یا انسانی فکر کو اس حد تک پابجولاں کرنا کہ وہ اس قسم کی بحثوں میں نہ الجھے سنت ہے؟ یا اس کو بالکل ہی بے لگام چھوڑ دینا بدعت ہے؟

اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ علم کی دو قسمیں ہیں:

ایک استقرائی یا تجرباتی علم ہے جس کا تعلق مادہ سے متعلق تحقیق اور اس دنیا کے رازہائے سربستہ کی جان کاری ہے۔

اس طرح کے علوم و فنون کو بیڑیاں نہیں پہنائی جا سکتیں۔ ان کی جانکاری، ان کا سیکھنا سکھانا اللہ اور اس کے رسول کی عین اطاعت ہے اور یہی قرآن و سنت کی حقیقی اتباع اور اس کی ہدایات پر صحیح عمل ہے۔

دوسرا مادہ سے ماوراء، جس کو الہیاتی یا عالم الغیب کا علم بھی کہا جاتا ہے۔ اس علم کا واحد ذریعہ صرف آسمانی وحی ہے۔ اس میں عقل و دانش کے گھوڑے نہیں دوڑائے جا سکتے۔

یہی وجہ ہے کہ مادہ سے ماوراء سے متعلق اکثر فلسفیانہ موشگافیاں فضول اور

بکواس ہیں۔ ان کی بنیاد نہ تو عقل سلیم پر ہے اور نہ ہی مستحکم منطقی اصولوں پر۔

اسی باعث ہم غیبی حقائق کے بارے میں شارعؑ کی جملہ بتائی ہوئی باتوں کو من وعن تسلیم کرتے ہیں۔ اپنی عقل وخرد صرف اجتہادی مسائل اور اس کائنات میں بکھرے قدرت کے رموز واسرار کو جاننے میں صرف کرتے ہیں۔

ایک ایسا شخص جسے ایٹمی توانائی، انعکاسی قوانین اور طبیعت وفطرت کے اصولوں کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ ہو، اس کی جستجو میں عرش پر اللہ کیسے متمکن ہوتا ہے اس کی جستجو میں لگ جائے تو بلاشبہ یہ سراسر احمقانہ عمل ہوگا۔

اسے سب سے پہلے اپنے سامنے موجود مادی وسائل کے بارے میں ضروری جانکاری حاصل کرنی چاہیے۔ پھر وہ کون سے وسائل اختیار کر کے عرش پر خدا کے تمکن کی حقیقت کو جان پائے گا؟

یہ حقیقت ہے کہ مادہ سے ماورا مباحث میں الجھنے کی قیمت اسلامی ذہن کو مادی وسائل میں غور وفکر کی کمی کی صورت میں چکانی پڑی۔ اس کے علاوہ اس کی عملی جد وجہد میں بھی کمی آ گئی۔ انصاف کی بات تو یہ ہے کہ الٰہیات سے متعلق فضول بحثوں میں الجھنے کی بھاری قیمت اسلام اور مسلمانوں کو ماضی میں بھی چکانی پڑی تھی اور اب بھی چکانی پڑ رہی ہے۔

غیب وشہادت کے درمیان

اللہ تعالیٰ نے ہر چیز میں ایک خاصیت رکھی ہے اور اس خاصیت کو اس سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

تمام لوگ تعمیر وترقی کے لیے ان خواص اور ان کے اثرات سے واقف ہیں اور حتی الامکان ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

موجودہ ترقی یافتہ تہذیب نے ان میں سے بہت سی خاصیتوں کو دریافت کر لیا ہے اور زندگی کے مختلف گوشوں میں ان سے فائدہ بھی اٹھا رہی ہے۔

ان خواص کا علم لوگوں کی اپنی معلومات، مسلسل تجربوں اور تحقیقوں کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر مسلسل تجربات کے ذریعہ کسی چیز کا ممکنہ خاصہ ایک حقیقت کی حیثیت

سے تسلیم کیا جا چکا ہے تو ایک مسلم کو بھی ان حقائق کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ اسلام کے نام پر ان مسلمہ حقائق میں کمی بیشی نہیں کرنی چاہیے۔ کوئی بھی مذہب توکل علی اللہ کے نام پر ان حقائق سے صرف نظر کرنے کی دعوت نہیں دیتا۔ اس طرح اللہ کے نام پر ان حقائق میں کوئی اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔

توکل قانون فطرت پر ضرب نہیں لگا سکتا۔ اسی طرح وہ مختلف عناصر کے خواص پر بھی اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ربنا الذی اعطی کل شئی خلقه ثم هدی ﴿طه: ۵۰﴾ ہمارے رب نے ہر شے کو خلقت عطا کی پھر اسے راہ دکھائی۔

آگ کی خاصیت جلانا ہے۔ اس حقیقت سے صرف نظر حماقت ہے۔ کوئی بھی مذہب اس کے برخلاف نہیں کہہ سکتا۔

ایمان کا تقاضہ ہے کہ ہم آگ کی اس خاصیت کو تسلیم کریں کیونکہ خدائے بزرگ و برتر نے یہ خاصیت اس کے مادہ میں ودیعت کی ہے۔

آسمان و زمین میں موجود تمام ذرات اپنا وجود اور حرکت قانون فطرت کے مطابق کرتے ہیں جس کی قدرت اور طاقت خدا تعالیٰ نے براہ راست انھیں بخشی ہے۔

اب اس قدر بدیہی حقیقت کے باوجود آپ قوانین فطرت سے چشم پوشی کیوں کرتے ہیں؟

جو حضرات توکل کے نام پر ان قوانین فطرت کو نظر انداز کرتے ہیں وہ بذات خود جہالت میں مبتلا ہیں۔

اسلام ان سے قطعاً بری ہے۔

یہ سب باتیں علم میں کمی کی علامت ہیں یقین و ایمان میں زیادتی کی نہیں۔

اسی طرح فطری اور طبعی خواص کے علاوہ کسی مادہ میں صرف اپنے وہم و گمان کے بل بوتے پر کسی خاصہ کا اضافہ کرنا بھی غلط ہے۔

پتھر کسی عمارت میں تو لگائے جا سکتے ہیں یا سڑک کے کنارے راستوں میں نصب کیے جا سکتے ہیں لیکن ان میں خدائی اوصاف کیسے پیدا کیے جا سکتے ہیں جیسا کہ

ان کے پجاری سمجھتے ہیں۔

یہی حال اللہ کی پیدا کردہ تمام مخلوق کا ہے۔ ناخواندہ لوگوں کے اعتقاد کی بنا پر ان کے خواص میں کمی یا زیادتی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ خواص تو قدرت کے مقرر کردہ ایک نظام کے تابع ہیں اور جن کی جانکاری ہمیں طبعی علوم بہم پہنچاتے ہیں۔

تعویذیں کسی مرض سے شفا یا رزق فراہم نہیں کر سکتیں۔

اللہ کا دین بھی ان حقائق کی تصدیق اور توثیق کرتا ہے۔

حضرت عبدؓاللہ ابن مسعود کے بارے میں روایت ہے کہ وہ اپنے گھر میں داخل ہوئے تو اپنی بیوی کے گلے میں کوئی تعویذ لٹکی ہوئی دیکھی، انھوں نے اسے کاٹ کر نکال دیا اور فرمایا کہ عبداللہ کے گھر والے شرک سے بے نیاز ہیں۔

اس کے بعد انھوں نے فرمایا، میں نے رسولؐ اللہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے، ''جھاڑ پھونک، تعویذ اور تولہ شرک ہے''۔ لوگوں نے پوچھا اے ابوعبدالرحمٰن جھاڑ پھونک اور تعویذ کو تو ہم جانتے ہیں لیکن یہ تولہ کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ یہ ایک ٹونکا ہے جسے بیویاں شوہروں کی منظور نظر بننے کے لیے پہنتی ہیں۔

مسند احمد میں حضرت عمرانؓ بن حصین سے روایت ہے کہ حضورؐ نے ایک شخص کے بازو پر پیتل کا ایک چھلا دیکھا تو فرمایا:

''تم پر افسوس، یہ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کمزوریوں سے حفاظت کے لیے۔ آپؐ نے فرمایا یہ صرف کمزوری میں اضافہ ہی کرے گی۔ اسے نوچ کے پھینک دو، کیونکہ اگر تم مر گئے اور یہ تم پر بندھا ہوا رہ گیا تو تم کبھی بھی کامیاب نہیں ہو گے''۔

ہم میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو قرآن کی مخصوص آیات کو اپنے سامنے آویزاں کر لیتے ہیں، اس بھرم کے ساتھ کہ اگر وہ تاجر ہیں تو نقصان سے محفوظ رہیں گے اور اگر ملازم ہیں تو مالک کے غیظ و غضب سے۔

یہ بیمار ذہن کی علامتیں ہیں اور اگر کوئی شخص ان سب باتوں کو اللہ پر ایمان اور اس کی کتاب کی عظمت سمجھ کے کرتا ہے تو وہ سادہ لوح اور بے وقوف ہے۔

ایک مسلمان کا قران کریم سے رشتہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کی آیتوں پر غور و فکر کرے اور اس کے اوامر و نواہی پر عمل کرے۔

اگر وہ تاجر یا ملازم ہے تو اس کی کامیابی اور ناکامیابی کا سارادارومدار اس کے کام پر ہوگا۔اس کے کام کی کمی کو چھوٹی یا بڑی قرآنی آیات کو آویزاں کر کے پورا نہیں کیا جا سکتا۔

قرآن شریف اور احادیث میں بہت سی دعاؤں کا ذکر ہے، جنھیں ناگفتہ بہ یا ناسازگار حالات میں پڑھنے کی تلقین کی گئی ہے۔

ان دعاؤں کے الفاظ و معانی، بہت ہی واضح ہیں جنھیں ایک مومن پوری امید لے کر پڑھتا ہے جن کی برکت سے اللہ تعالیٰ اس کی پریشانیاں دور فرما دیتا ہے اور اسے اپنی آغوش رحمت میں لے لیتا ہے۔

یہی اصل دعائیں ہیں، جنھیں پڑھنے کی ہم بھی تلقین کرتے ہیں، کیونکہ خود شارع نے یہ دعائیں ہمیں سکھائی ہیں۔ان دعاؤں کا تعلق قانون فطرت سے بھی ہے۔

اگر کوئی عاجز و درماندہ شخص قادر مطلق سے کوئی ایسی چیز مانگتا ہے جو اس کی حکمت عامہ سے میل کھاتی ہے تو اس کی دعا قبول کرنے سے کوئی انتشار یا فساد برپا نہیں ہوگا بلکہ ایک ذاکر اور شاکر بندے کی مدد ہوگی۔

حضوؐر کی سنت مبارکہ تھی کہ جب کسی مریض کی عیادت فرماتے تو یہ کہتے:

اذهب الباس رب الناس، اشف وانت الشافي، لاشفاء الاشفاء ك شفاء لايغادر سقما.

اے لوگوں کے رب! تکلیف کو زائل کر دے، تو شفا عطا کر تو ہی شفا دینے والا ہے۔تیری شفا کے علاوہ اور کوئی شفا نہیں ہے۔تو ایسی شفا دے جو کوئی بیماری نہ چھوڑے۔

جب حضرت ایوبؑ پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے تو وہ بھی اپنے رب کی طرف متوجہ ہو کے اس طرح نجات کے طالب ہوئے:

وايوب اذ نادىٰ ربه انى مسنى الضر وانت ارحم الرحمين فاستجبناله فكشفنا ما به من ضر وآتيناه اهله و مثلهم معهم، رحمة من عندنا و ذكرى للعابدين. ﴿الانبیاء:۸۳-۸۴﴾

اور یاد کرو ایوب کو جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھے تکلیف نے آگھیرا ہے اور تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے، تو ہم نے اس کی دعا قبول کر لی اور اس کی تکالیف دور کر دیں، ہم نے اس کی اہل اسے عطا کی اور ان کے ساتھ اتنی ہی تعداد اور بھی، اپنی رحمت سے اور تا کہ عبادت کرنے والوں کو نشانی رہے۔

اس لیے بندوں کو چاہیے کہ وہ اللہ کے دربار میں حاضری دیں اور اس سے مدد طلب کریں، مگر یہ بات ضرور گوش گذار کر لیں کہ دعا قانون فطرت یا کون ومکان کے طبعی اسباب کو نہیں توڑ سکتی کوئی کنوارہ شخص باپ نہیں بن سکتا، خواہ وہ ہزار سال تک دست بدعا رہے۔ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کی دعا قبول فرماتا ہے تو اسے یہ بھی توفیق دیتا ہے کہ وہ صحیح وسائل استعمال کرے اور ممکنہ رکاوٹوں کو دور کرے۔

اگر بندہ کوئی ایسی چیز طلب کرتا ہے جو انسانی دسترس سے باہر ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اپنی حکمت ورحمت کے مطابق ہی اسے قبول فرماتا ہے۔

انسان تو جبلی طور سے جلد باز واقع ہوا ہے۔ جب بحران سے واسطہ پڑتا ہے تو خدا کے سامنے گریہ وزاری کرتا ہے اور جیسے ہی خوشحالی کا منہ دیکھتا ہے سرکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے:

کلاوان الانسان لیطغی ان رآہ استغنی ﴿قلم:٦-٧﴾	ہرگز نہیں انسان سرکش ہو جاتا ہے جب خود کو مالدار پاتا ہے۔

اللہ کے سامنے مذکورہ بالا صورتوں میں گریہ وزاری میں کوئی گناہ نہیں ہے بلکہ یہ تو عین ایمان ہے اور عین ثواب۔

ان میں شرک کا وہ شائبہ بھی نہیں ہے جس سے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے باز رہنے کی تلقین کی تھی۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے تو جادو، ٹونا ٹوٹکا کرنے والوں کو جھاڑ پھونک، تعویذ گنڈوں اور نقوش وغیرہ سے منع فرمایا تھا جن کے ساتھ صرف خرافات اور باطل اوہام وابستہ ہوتے ہیں اور اس بھرم میں مبتلا ہوتے ہیں کہ یہ تعویذیں وغیرہ ان کی راہ میں حائل تمام رکاوٹوں کو دور کر کے ان کی مراد پوری کر دیں گی۔

تعجب اور افسوس کی بات یہ ہوئی کہ مسلمان بھی ان خرافات میں مبتلا ہو گئے۔ جب وہ دنیاوی کاموں کو ٹھیک طور سے انجام دینے کی صلاحیت کھو بیٹھے تو انھوں نے تعویذ گنڈوں کا سہارا لیا اور پھر رونا تو اس بات کا ہے کہ انھوں نے ان تعویذ گنڈوں کو دین کا ایک جز بنا لیا۔

اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ یہ دنیاوی قیادت سے محروم کر دیے گئے اور ان کی جگہ

قوموں کی قیادت انھیں عطا کر دی گئی، جنھوں نے قدرت کے رازوں کو سمجھا، قوانین فطرت پر عمل کیا اور پھر کارہائے نمایاں انجام دیے۔

کیا اس دنیاوی پسپائی سے ہم نے اپنے رب کو خوش کیا ہے یا اپنے دین کو قابل احترام بنایا ہے؟

ہمارے قدیم علماء کلام نے اسباب اور مسببات کے رشتہ پر جو بحث کی ہے وہ مسلمانوں کے احساس و خیالات کے لیے زہر قاتل ثابت ہوئی ہے۔ جو نادان علماء اس مسئلے میں اہل سنت کے عقیدے کی بات کرتے ہیں ان کے پاس عقلی یا شرعی کوئی بھی دلیل نہیں ہے۔

یہ لوگ بڑے طمطراق سے کہتے ہیں کہ آگ کے اندر بذات خود جلانے کی صلاحیت نہیں ہے لیکن جب کوئی چیز اس کے قریب پہنچتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے اندر یہ صلاحیت پیدا کر دیتا ہے۔

ان کے مطابق اسی طرح پانی کے اندر پیاس بجھانے کی اور تلوار میں کاٹ کرنے کی صلاحیت بھی اسی وقت اللہ تعالیٰ پیدا کر دیتا ہے۔

کیا یہ سب باتیں کان دھرنے کے لائق ہیں؟

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے علماء کی ان واہیات باتوں پر اظہار تعجب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کیا کوئی بھی ذی شعور شخص یہ مان سکتا ہے کہ آگ میں بذات خود جلانے کی صلاحیت نہیں ہے بلکہ عین موقع پر اللہ تعالیٰ اس کے اندر یہ صلاحیت پیدا کر دیتا ہے؟

اس کے بعد علامہ ابن تیمیہؒ نے اس ضمن میں وارد قرآن کی کئی آیتوں کا حوالہ دیتے ہوئے یہ آیت بھی نقل کی ہے:

وینزل من السماء ماء لیطهر کم ویذهب عنکم رجز الشیطان ولیربط علی قلو بکم ویثبت الاقدام۔ ﴿سورة الانفال: ١١﴾	اور آسمان سے پانی برساتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ تمھیں پاک وصاف کرے اور شیطان کی ناپاکی زائل کرے اور تاکہ تمھارے دلوں کو مربوط کر دے اور اس سے تمھیں ثابت قدم رکھے۔

علامہ ابن تیمیہؒ اس کے بعد رقم طراز ہیں کہ کامیابی اور ہدایت یافتہ لوگ اللہ

کے علم، اس کی قدرت، اس کی مشیت اور اس کی وحدانیت پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ بات مانتے ہیں کہ وہی ہر چیز کا خالق، رب اور مالک ہے۔

اس کے باوجود وہ قدرت کے پیدا کردہ اسباب اور مسببات سے انکار نہیں کرتے۔

ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

حتی اذا أقلت سحابا ثقالا سقناه لبلد میت فانزلنا به الماء فاخرجنا به من کل الثمرات ﴿الاعراف:۵۷﴾

پھر جب ہوائیں بھاری بادلوں کو اٹھالیتی ہیں تو ہم اسے کسی مردار شہر کی طرف ہانک لے جاتے ہیں اور پھر اس سے پانی برساتے ہیں اور پھر اس سے تمام انواع واقسام کے پھل پیدا کرتے ہیں۔

دوسری جگہ اسی بات کو اس طرح کہا گیا ہے:

یهدی به الله من اتبع رضوانه سبیل السلام ﴿مائده:۱۶﴾

اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ اپنی خوشنودی کے طالب کو سلامتی کا راستہ دکھاتا ہے۔

اسی بات کو تیسری جگہ ان الفاظ میں کہا گیا ہے:

یضل به کثیرا ویهدی به کثیرا ﴿بقرة:۲۶﴾

اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے۔

اس حقیقت کے باوجود اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے ان اسباب کے موجود ہونے پر کرتا ہے ان اسباب کے ذریعہ نہیں تو وہ قرآن کی اس واضح تصریح کے خلاف کہتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی فطرت میں جو تاثیر اور قوت رکھی ہے وہ اس سے انکار کرتا ہے۔

ان مذکورہ بالا آیات میں اور انہی جیسی دوسری آیتوں میں جس بدیہی حقیقت کی نشاندہی کی گئی ہے اس سے چشم پوشی کیوں کی جاتی ہے اور اس کا سبب کیا ہے؟

پھر ہم توحید کے عقیدہ کی آبیاری کے لیے فرضی اور موہوم باتوں کا سہارا کیوں لیتے ہیں؟ بات دراصل یہ ہے کہ مسلم عوام کی نظروں میں نفس اسباب کی قدر و قیمت ہی جاتی رہی کیونکہ ان کے درمیان عام طور سے یہ بات مشہور ہوگئی ہے کہ چیزوں کی فطری تاثیر عقیدہ باطل ہے۔

ان کے ذہنوں میں تو یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ کبھی کبھی اسباب کے موجود ہونے پر بھی اس کے متوقع نتائج موقوف ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھی یہ نتائج بذات خود ظہور پذیر بھی ہو جاتے ہیں۔

اور جب ان کے ذہنوں میں موجود اسباب اور مسببات کا یہ تعلق ٹوٹ گیا تو ان میں طرح طرح کی خرافات اور توہمات کا قدم جمانا لازمی تھا۔

ان خرافات میں سب سے بڑی خرافات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صبح وشام اپنے نیک و بدکار مومن و کافر بندوں کے ہاتھوں ناممکنات اور خوارق عادات چیزوں کا مظاہرہ کراتا رہتا ہے۔ جب یہ خارق عادت چیز کسی نبی کے ہاتھوں ظاہر ہوتی ہے تو معجزہ کہلاتی ہے اور جب ولی کے ہاتھوں ہوتی ہے تو کرامت اور جب کسی فاسق و فاجر کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوتی ہے تو استدراج یا ڈھیل کہلاتی ہے۔

اس پر طرفہ تماشا یہ ہوا کہ اس عقیدہ کو نفس ایمان کے ساتھ جوڑ دیا گیا اور جو بے چارہ بھی کسی شخص کی طرف منسوب ان خوارق عادات پر شک کرتا اسے الٹا خود ہی بے عقیدہ اور بے ایمان بنا دیا گیا۔

انصاف کی بات تو یہ تھی کہ ان سب باتوں کو عقیدہ اور اصول ایمان سے دور ہی رکھا جاتا۔ صرف نبوت سے متعلق معجزات ہی سے سروکار رکھنا چاہیے تھا۔ کرامات اور استدراج وغیرہ کی خرافات میں پڑنے سے کہیں بہتر تو یہ تھا کہ قدیم اسلامی فکر کی طرح دیگر اسلامی یا شہری علوم کی طرف توجہ دی جاتی۔

مسلمانوں کو یہ حقیقت ہمیشہ مدنظر رکھنی چاہیے کہ ان کے دین اور دنیا دونوں کی صلاح اس وقت تک ممکن نہیں ہوگی جب تک کہ ان کے امور ان طریقوں پر انجام دیے جاتے رہیں گے جنھیں نہ تو وحی تقویت بخشتی ہے اور نہ ہی صحیح زاویہ فکر۔

ابن الجوزی اپنی مشہور کتاب ''صید الخاطر'' میں لکھتے ہیں:

''مجھ پر ایک حال طاری ہوا۔ میں نے اپنے قلب کو اللہ عز وجل کی طرف متوجہ کرتے ہوئے سوچا کہ اس کے علاوہ اور کوئی بھی طاقت مجھے نہ تو فائدہ پہنچا سکتی ہے اور نہ ہی میری مصیبت کو دفع کر سکتی ہے۔

پھر میں نے اسباب پر نظر ڈالی جسے میرے یقین و ایمان نے غلط ٹھہرایا اور کہا

یہ توکل میں کمی کی علامت ہے۔ میں نے مزید غور کیا اور کہا نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کچھ تاثیرات پیدا کی ہیں جن کی رعایت ضروری ہے۔ میری حالت کا مطلب یہ تھا کہ قدرت کی طرف سے رکھی گئی تاثیرات بے فائدہ اور ان کا وجود اور عدم دونوں برابر ہیں۔

یہ بات کیسے ممکن ہے جبکہ اس کے اسباب شریعت میں موجود ہیں۔ خود قرآن شریف میں مذکور ہے:

واذا كنت فيهم فاقمت لهم الصلوة فلتقم طائفة منهم معك وليأخذوا اسلحتهم ﴿النسا:۱۰۱﴾

اور جب تم ان میں موجود ہو اور نماز پڑھاؤ تو ان میں کی ایک جماعت اپنے اسلحہ کو لیکر تمہارے ساتھ کھڑی ہو جائے۔

پھر دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے:

فذروه في سنبله. ﴿یوسف:۴۷﴾

دانوں کو ان کی بال میں چھوڑ دو۔

خود حضور اکرمؐ دو دو زرہیں پہن کر کے میدان جنگ میں نکلے تھے اور بیماری کی حالت میں دو دو طبیبوں سے مشورہ بھی کیا تھا۔

اور پھر جب یہی ذات نبوی طائف گئی تو پھر مکہ میں دوبارہ واپسی کے لیے مطعم بن عدی کی پناہ لینی پڑی اور پھر ان کی پناہ کے زیر سایہ مکہ میں داخلہ ممکن ہو سکا۔

وہ تو بذات خود نبیؐ تھے۔ اللہ پر توکل کر کے بغیر ظاہری اسباب اختیار کیے ہوئے مکہ میں داخل ہو سکتے تھے۔

لہٰذا جب شریعت نے خود ہی تمام امور کا تعلق اسباب سے جوڑ دیا ہے تو اسباب سے روگردانی یقینی طور سے خدائی حکم کے خلاف ہوئی۔

اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ بیماری میں دوا لینا افضل ہے۔

میرے ایک ساتھی نے امام احمدؒ بن حنبل کا یہ قول نقل کیا کہ دوا کا نہ لینا افضل ہے لیکن دلیلوں نے مجھے ان کی اتباع کرنے سے روک دیا۔

حضورؐ سے ایک صحیح حدیث مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا ہے، ''کوئی ایسا مرض نہیں ہے جس کی دوا اللہ تعالیٰ نے نہ اتاری ہو لہٰذا تم دوا کرو''۔

ان الفاظ کا واضح مطلب ہے کہ حضورؐ نے اپنی امت کو یہ حکم دیا ہے۔

اور حکم یا تو واجب ہوتا ہے یا مستحب اور اس سے قبل کوئی ممانعت نہیں تھی، جس سے یہ پتہ چلے کہ یہ حکم مباح ہے۔

حضرت عائشہ فرماتی تھیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے امراض کی کثرت اور آپؐ کے لیے تجویز کی جانے والی دواؤں سے طب سیکھی۔

ایک موقع پر حضورؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا، ''اسے کھاؤ کیونکہ یہ تمہارے مناسب حال ہے''۔

جو لوگ علاج معالجہ کے ترک کو افضل مانتے ہیں وہ حضورؐ کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں، ''جنت میں ستر ہزار لوگ بغیر حساب کتاب کے جائیں گے'' اور پھر ان کے بارے میں یہ فرمایا ہے، ''نہ تو وہ گرم سلائی لگاتے ہیں، نہ ہی جھاڑ پھونک کرتے ہیں اور نہ ہی فال نکالتے ہیں اور اپنے رب پر توکل رکھتے ہیں''۔

لیکن یہ حدیث نفس دوا کے خلاف نہیں ہے کیونکہ عرب میں کچھ لوگ گرم سلائی پھرواتے تھے تاکہ بیمار نہ ہوں اور جھاڑ پھونک کراتے تھے تاکہ مصیبتوں اور بلاؤں سے محفوظ رہیں۔

خود حضورؐ نے حضرت سعد بن زرارہؓ کو ''کی'' یعنی گرم سلائی لگائی تھی اور حدیث صحیح کی رو سے جھاڑ پھونک کی اجازت دی ہے۔

خود جب مجھے اسہال کی شکایت ہوتی ہے تو لبنان کا پھل بلوط کھاتا یا ہندوستانی املی کا شربت پیتا ہوں۔

اگر میں یہ موافق دوائیں نہ لوں اور پھر دعا کروں، ''اے اللہ مجھے عافیت بخش'' تو مجھ سے حکمت ضرور کہتی کیا تم نے وہ حدیث نہیں سنی ہے کہ پہلے اونٹ کو باندھ پھر توکل کر؟ اسی طرح پہلے دوا لو اور پھر دعا کرو کہ اللہ مجھے شفا عطا فرما۔ خبردار اس حرماں نصیب شخص کی طرح نہ بنو جو نہر کے کنارے کھڑا ہے اور نہر میں ہاتھ ڈال کے پانی اٹھانے کے بجائے سیرابی کے لیے نماز استقاء پڑھ رہا ہے۔

اس شخص کا حال بعینہ اس شخص کی طرح ہے جو یہ تجربہ کرنے کے لیے سفر کر رہا ہو کہ دیکھیں سفر کے دوران اللہ تعالیٰ اسے روزی دیتا ہے یا نہیں؟

خدا تعالیٰ تو پہلے ہی حکم دے چکا ہے، ''وتزودوا'' یعنی زادِ راہ لے لو اب اگر اس

پر بھی وہ زادِراہ نہیں لیتا ہے تو اس کی ہلاکت میں کیا شبہ رہ جائے گا۔ اس طرح اگر نماز کا وقت ہو گیا اور وہ پانی لے کر نہیں چلا تھا تو اس سے یہ ضرور کہا جائے گا کہ تم پانی لے کر کیوں نہیں آئے۔

لہٰذا ہوشیار رہیے اور خدا کے لیے ہوشیار رہیے۔ جنھوں نے بال کی کھال نکالی اور دین کی حقیقت سے کوسوں دور چلے گئے۔ انھوں نے غلط طور سے یہ سمجھ لیا کہ دین میں کمال قوانین طبعیت سے نکل جانے اور قوانین فطرت کی مخالفت سے پیدا ہوتا ہے۔

اگر میرے اندر علم کی قوت اور قدرتِ بیان حاصل نہ ہوتی تو نہ تو میں ان چیزوں کی اتنی وضاحت کر سکتا اور نہ ہی ان کی معرفت حاصل کر پاتا۔ لہٰذا میری مذکورہ باتوں کو دھیان سے پڑھو اور سمجھو۔ لوگوں کی الٹی سیدھی اور غیر معقول باتوں کے مقابلے میں یہ باتیں تمہارے لیے مفید ثابت ہوں گی۔ تم اہل معانی اور سمجھ دار لوگوں کا ساتھ پکڑو، اہل خرافات کا نہیں''۔ (صید الخاطر۔ ابن الجوزی)

ایمان زندگی کی روح ہے

ایمان کا اولین تقاضا یہ ہے کہ وہ عظیم حقیقت کی تصدیق کرے اور اعلیٰ وجود کا اعتراف کرے اور پھر رب عظیم کے سامنے انسان کے محدود مرتبے کو پہچانے، اس کے ہاتھ میں ہر شے کی بادشاہت ہے اور وہ پناہ دیتا ہے اسے پناہ نہیں دی جا سکتی وغیرہ وغیرہ۔

پھر ان سب باتوں کے علاوہ ایمان کا ایک اور لازمی جز ہے اور وہ ہے نیک عمل پر ابھارنے والی قوت۔

ایمان ایک ایسی قوت ہے جو انسان کو اس بات کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔ اس طرح اس کی پوری زندگی میں وہ رہنمائی کرتا ہے۔

جیسے معدہ سے خارج ہونے والے ہارمونز کھانے کو ہضم کرتے ہیں اور جسم کے لیے سودمند اجزاء کو سمیٹ لیتے ہیں اسی طرح سے یہ ایمان بھی عام افعال کو مقبول عبادات میں بدل دیتا ہے۔ اور اس میں وہ خاص کیفیت پیدا کر دیتا ہے، جس سے وہ

اللہ کے دربار میں شرف قبولیت حاصل کرلیں۔

اوراس عقیدہ وایمان سے خالی دل کا مطلب ہے انسان کے اعمال کا رائگاں چلے جانا اور اللہ کی طرف سے کسی جزاء یا ثواب سے محروم رہنا۔

کیونکہ اللہ پر ایمان رکھنا عمل کے خیر اور کوشش کی قبولیت کے لیے بنیادی شرط ہے۔

ارشاد باری ہے:

يـا قـوم انما هذه الحياة الدنيا متاع وان الآخـرة هي دار القرار، من عمل سيئة فلا يجزى الامثلها ومن عمل صالحـا من ذكر اوانثى وهومؤ من فـاولئك يـدخلـون الجنة يرزقون فيها بغير حساب ﴿غافر:۳۹-۴۰﴾	اے قوم یہ دنیاوی زندگی چند روزہ ہے اور آخرت ہی ہمیشہ کا گھر ہے۔جس نے برا کام کیا اس کو صرف اتنا ہی بدلہ ملے گا اور جس نے اچھا کام کیا مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہوں تو وہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے جس میں بے حساب رزق دیے جائیں گے۔

لیکن شب وروز کی مشقت سے بھری ہوئی اس انسانی زندگی میں خالص ایمان ہی سے کام نہیں چلتا۔

اور وہ بھی جبکہ انسان کے اکثر اعمال اپنے رب سے غفلت کی حالت میں سرزد ہوتے ہیں اور صرف نفس پرستی یا جاہ پرستی کا ثمرہ ہوتے ہیں۔

اعمال کے ناپ تول کے لیے اسلام نے نیت کا ایک جامع اور زریں اصول مقرر کردیا ہے۔ وہی اعمال مقبول ہیں جن میں خالص خدا کی رضا مطلوب ہو اور باقی سب مردود، خواہ وہ بظاہر کتنے ہی دل کش کیوں نہ ہوں۔

لوگوں نے کچھ دوسرے معیار بھی بنالیے ہیں، خودساختہ معیار، اللہ کے نازل کردہ نہیں، اور پھر انہی کے ذریعہ وہ خیر اور شر کا حکم لگاتے ہیں۔

یہاں پر ان مختلف معیاروں پر نقد وجرح کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

کچھ معیاروں پر علم اخلاق نے بحث کی ہے اور کچھ پر قوانین معاشرت نے بحث کی ہے اور ان معیاروں کو لوگوں نے اس طرح پکڑ لیا ہے جیسے وہ سکے یا نوٹ پکڑتے ہیں۔

ان معیاروں کا وہی حال ہے جیسا کہ اس زمانے میں کرنسی کا ہے، کاغذ کے نوٹ جس کے دام لوگ اپنے حساب سے بڑھاتے رہتے ہیں۔

اس طرح لوگوں کے خود ساختہ بیشتر معیار ہیں جن کے بل بوتے پر کچھ قوموں کو برتر قرار دیتے ہیں اور کچھ کو بدتر۔

☆☆☆

موجودہ دور کا ایک زبردست المیہ اجتماعی اور سیاسی بلکہ نفسیاتی اور تربیتی میدانوں میں مذہبی اخوت کی جگہ قومی عصبیت ہے اس قومی عصبیت یا قوم پرستی کو اس وقت اور زیادہ مہمیز دیجاتی ہے جب مسلمانوں کی عام زندگی سے اسلامی اخوت کے رشتہ کو کمزور کرنا مقصود ہو۔

وطن کی محبت ایک ناقابل انکار حقیقت ہے اور اپنے وطن کا دفاع ایک لازمی فریضہ بھی۔

لیکن وطن پرستی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان اپنے دین سے رشتہ توڑے یا اپنے رب سے کیے گئے عہد و پیماں ہی کو توڑ ڈالے۔

قومی عصبیت:

امت اسلامیہ پر عہد حاضر کی استعماری یلغار کا ایک بدترین نتیجہ اسلامی وحدت واخوت کے قلعہ میں شگاف پڑنا اور اس میں انتشار برپا ہونا ہے۔ آج یہ چھوٹی چھوٹی قومیتوں اور ایک دوسرے سے نفرت کرنے والے فرقوں میں مُنقسم ہے۔ اسی قومی عصبیت نے انھیں چھوٹی چھوٹی امارات اور مملکتوں میں محصور کر دیا ہے۔

اس سے قبل مسلمان ایک امت تھے اور اسلام نے ان کی شیرازہ بندی کی تھی لیکن اب استعمار نے عربوں اور مسلمانوں کو قومیتوں کے چھوٹے چھوٹے خانوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

آپ ایک انسان کے مکمل جسم کا تصور کیجئے اور پھر اس کے ایک ایک عضو سے الگ الگ کہیے کہ تم اپنی اپنی سوچو اور دوسرے اعضاء کی فکر کرنا چھوڑ دو۔

ایسے میں جبکہ ہاتھ ایک ملک ہو اور پاؤں ایک دوسرا ملک، آنکھ ایک ملک اور

کان دوسرا ملک۔

دماغ اور دل میں کوئی رشتہ نہ رہے اور نہ ہی دل اور اس کے اعضاء کے درمیان کوئی تعلق۔

کیا یہ کام کوئی زندگی بخشنے والا ڈاکٹر کر سکتا ہے یا قتل کا ارادہ کرنے والا قصائی؟

یورپ کے بازیگروں نے یہ منصوبہ بنایا اور پھر اس خاکہ میں رنگ بھر دیا۔

جب جب جسم کے ان منتشر اعضاء میں حرکت پیدا ہوئی اور انھوں نے ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی کوشش کی تو استعمار نے پھر سے وہی پرانا فسوں پھونک کے انھیں یہ باور کرا دیا کہ تم تو محفوظ ہو، عیش کرو، اوروں کی کیوں فکر کرتے ہو۔

افسوس صد افسوس، یہ قومی عصبیت خودکشی نہیں تو اور کیا ہے؟

اس المیہ کی اصل جڑ ہے قبائلی عصبیت اور تنگ نظر قوم پرستی۔ اس مہلک مرض نے اسلام کی رگوں کو لہولہان کر دیا ہے۔

یہ تنگ نظر اور تنگ دل عصبیت صرف انسانیت ہی کے لیے کلنک ثابت نہیں ہوئی ہے بلکہ اسلام کے موجودہ دور میں اور اسلام کی موجودہ حالت میں یہ ایک گناہ بن کے سامنے آئی ہے۔

اسی تنگ و تاریک راستے سے ملت نے اپنے عزیز علاقوں کو بیرونی حملہ آوروں کے حوالہ کر دیا۔

یہ سب کس کے نام پر ہوا؟ قوم پرستی کے نام پر۔

درحقیقت نئے حملہ آوروں کو وہ نکتہ رسا مل گیا تھا جس تک رسائی قدیم صلیبی قوتوں کو نہیں ہوئی تھی۔ انھوں نے اسلام کے خلاف، اس کی عظمت کو پاش پاش کرنے کے لیے، اس کے حصے بخرے کرنے کے لیے اور اس کے مستقبل کو تاریک بنانے کے لیے سب سے کامیاب نسخہ یہ دریافت کیا کہ ان کے دلوں میں سے ایمان کی لذت، بندوں اور اللہ کے تئیں ان کے حقوق سے خالی کر کے ان میں قوم کی پر فریب محبت بھر دی جائے، یہاں تک کہ وہ اپنے دل و دماغ کی آواز بھی نہ سن سکیں۔

اور جب نوبت یہاں تک پہنچ جائے تو پھر اللہ کے لیے نہ تو پہلے ہی کچھ رہ

جائے گا اور نہ ہی بعد میں کچھ باقی بچے گا۔

مسلمانوں کے اندر یہ نئی نفرت آمیز سوچ، فکر اور جذبہ کو ابھارا ہے، جیسا کہ میں نے ابھی ابھی عرض کیا ہے، اسی مردود استعمار نے جسے ہم سے شدید بیر ہے اور جسے ہمارے ماضی، ہمارے حال اور ہمارے مستقبل سے نفرت ہے۔

انھوں نے قومی نعروں اور علاقائی فتنوں کے سہارے اسلامی وحدت کے شیرازے کو پاش پاش کر ڈالا۔ اس طرح انھوں نے وہ کام انجام دے ڈالا جو وہ فوجوں اور ہتھیاروں سے نہیں کر سکتے تھے۔

مغربی قومیتوں نے تو مشرقی ملکوں پر یلغار کے وقت دین کو ایک مستقل عنصر مانا اور دین ہی کے جھنڈے تلے تمام یورپی قوموں کو یکجا کیا جبکہ اسلامی ملکوں میں اسی دینی عنصر کو بالکل ہی خارج کر دیا گیا چنانچہ الجزائر کے مسلمانوں سے یہ کہا گیا کہ وہ تونسی مسلمانوں کی بربادی پر نہ تو آنسو بہائیں اور نہ ہی کوئی قدم اٹھائیں۔

جب مصر میں اسلام کو نشانہ بنایا گیا تو عراقیوں سے کہہ دیا گیا کہ نہ تو وہ شور مچائیں اور نہ ہی کوئی الٹی سیدھی حرکت کریں۔

اس طرح قدیم چیزوں سے گلوخلاصی اور خالص وطن پرستی کا اصل نشانہ صرف اور صرف اسلام اور مسلمان بنے۔

انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم یہاں قوم پرستی کے بارے میں ایک عیسائی مغربی مفکر کے خیالات بھی قلم بند کرتے چلیں:

امری ریفز نے اپنی کتاب ''مسئلہ امن'' میں اس قضیہ پر بحث کرتے ہوئے اس کے انسانی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ اس نے اخلاق و کردار کے اصولوں کے درمیان اس کی قدر و قیمت بتاتے ہوئے دنیا کو اس کے بدترین انجام سے ڈرایا۔ اس کے بعد وہ ''دین کو مسخ کرنے'' کے عنوان سے یوں رقم طراز ہے:

''آج کل تمام ملکوں میں قومیت کا نعرہ بلند ہے لیکن یہ بات بھی مشاہدہ میں آئی ہے کہ قومی مقاصد کے حصول کے لیے دین کے چہرے کو مسخ کر دیا گیا ہے اور اسے پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ عیسائیت کا سب سے مقدس عنصر یہ ہے کہ وہ ایک عالمی مذہب ہے اور اس کا سب سے بنیادی اصول یہ ہے کہ تمام لوگ اللہ کے نزدیک

برابر ہیں، وہ ایک معبود کی عبادت کرتے ہیں اور تمام لوگوں کے لیے اس کا قانون یکساں ہے۔

انسانی تاریخ میں یہ ایک انقلابی سوچ تھی۔

لیکن قومیت پر مبنی حکومتوں نے اس سوچ کے اخلاقی اثرات پر قدغن لگا دیا۔

مغربی دنیا میں ابھرنے والا یہ قومی شعور عیسائی شعور پر غالب آ گیا۔

عیسائی کلیسا جو پہلے ہی تقسیم تھا اسکی مزید تقسیم در تقسیم ہوگئی اور پھر ہر کلیسا ایک خاص قومیت کی اعلیٰ اقدار کا ترجمان بن گیا۔

اور پھر ہر ملک میں یہ بات مان لی گئی کہ قومی سیاست ہی دراصل عیسائی سیاست ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائی کلیسا قومی انجمنیں بن گئے جو اپنی توانائی قومیت کی روح سے حاصل کرتے تھے۔

آج ہزاروں کلیساؤں میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ پادری اپنے ہم وطنوں کے لیے عزت وشرف کی دعائیں کرتے ہیں لیکن دوسروں کے لیے بربادی اور تباہی کی۔

یہی چیز مذہب کے ذریعہ انسانیت کو عطا کی ہوئی اعلیٰ اقدار کی بالکل ضد ہے۔

اخلاقی اور تکوینی اصول نہ تو اخلاقی ہوں گے اور نہ ہی تکوینی اگر انھیں روبہ عمل لانے کے لیے انسانوں کو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بانٹنا ضروری ہو۔

مثال کے طور پر ''قتل نہ کرو'' کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اپنے ہم وطن کو تو قتل کرنا جرم ہے لیکن دوسرے ملک کے باشندے کو قتل کرنا عین ثواب۔

موجودہ زمانے میں تینوں آسمانی مذاہب میں یہی رجحان پیدا ہوا ہے۔

قرآن شریف نے مختلف اسلامی قوموں کے درمیان وحدت کا جو تصور صدیوں تک برقرار رکھا تھا اب معدوم ہو چکا ہے اور اسلامی قوم اب مختلف قومیات میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے۔

ترک مسلمان ترکی کی نسل کے لوگوں کو ایک جھنڈے تلے بلا رہے ہیں تو عرب قومیت کے علم بردار عربوں کو متحد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

یہ تمام لوگ اس عالمی رنگ کو بھول چکے ہیں جو مذہب اسلام کی عظیم بنیادوں میں موجود تھا۔

معاملہ صرف عیسائیت اور اسلام ہی تک محدود نہیں رہا۔ سب سے قدیم موحدین یعنی یہودی بھی مذہب کی ان بنیادی تعلیمات کو بھول گئے۔

لگتا ہے کہ انھیں یہ بات بھی یاد نہیں رہی کہ اللہ تبارک تعالیٰ نے، جو ایک ہے اور یکتا ہے، انھیں توحید پھیلانے کے لیے چنا تھا۔

اب وہ بھی خاص قومیت کی آمیزش زدہ جذبات کے ساتھ اپنے قومی معبود کی پرستش کرتے ہیں اور اپنا قومی ملک بنانے میں مصروف ہیں۔

اس عالمی پیغام کو قومیت کی وجہ سے کس قدر مصائب اور عذاب۔ سے دو چار ہونا پڑا ہے۔ دراصل اسی قومیت کا دوسرا نام ہے قبائلی عصبیت اور یہی ساری مصیبتوں کی جڑ ہے۔

محدود و تنگ قومی معرکہ آرائیوں سے عالمی توحید کے عقیدہ کو جو کاری ضرب پہنچی ہے وہ اب پوری انسانیت کے مستقبل کے لیے بہت بڑا خطرہ بن چکی ہے۔

اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ قومیت کا سہارا لیے بغیر انسانی آزادی کو نہ تو قائم کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی برقرار رکھا جا سکتا ہے۔

اگر عیسائی کلیسا اپنے مرکزی اصول کی طرف واپس نہیں پلٹے اور انھوں نے اسے اپنے عمل کا نقطۂ آغاز نہیں بنایا تو یہ نیا سرکشی عقیدہ انھیں خس و خاشاک کی طرح بہا لے جائے گا۔ اس لیے انھیں لامحالہ قومی نعروں کے پیدا کردہ مصائب و آلام کی خانہ خرابی سے باہر نکلنا ہی ہوگا''۔

مذکورہ بالا باتیں کتنی مناسب اور برحق ہیں۔

ہم مسلمانوں کو بھی متنبہ کرتے ہیں کہ وہ اس کلام کی حقیقت کو سمجھیں اور اس کی روشنی میں دو برہنہ حقیقتوں کو دیکھیں:

۱۔ انسان کی قدیم جاہلیت کی طرف واپسی اور وطن، رنگ اور خون کا اندھا تعصب گمراہی کی ایک قسم ہے جو ہمیں زیب نہیں دیتی۔

۲۔ یہ واپسی اسلام اور مسلمانوں کے لیے بلاشبہ نقصان دہ ہے اور جدید یورپی استعمار کے لیے سودمند۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ مسلمانوں کے خلاف کھلم کھلا ریشہ دوانیاں ہو رہی ہیں۔

مذہبی عصبیت کا سہارا لیکر یہودی مملکت قائم ہو چکی ہے اور دنیا نے اسے تسلیم بھی کر لیا جبکہ مسلمانوں کے لیے اپنے دین و مذہب کے نام پر جمع ہونا جرم قرار دے دیا گیا۔

دنیا بھر کے یہودیوں نے اسرائیلی حکومت کے قیام میں دامے درمے سخنے ہر طرح سے معاونت کی اور اسے استقامت بخشنے میں مدد کی۔

صہیونیت ہی کی طرح صلیبی طاقتیں بھی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہر طرح کی سازشیں کر رہی ہیں۔

مسلمان ایک طویل عرصہ سے پے در پے مصائب و آلام سے گذر رہے ہیں اور درد سے سسک رہے ہیں.........

☆☆☆

باب ۔۳

بدعاتِ عبادات

آج کل، وجد اور حال کی مجلسیں اور ذکر کے حلقے دھیرے دھیرے غائب ہوتے جارہے ہیں، اس طرح کی ایجاد کردہ عبادات کا سلسلہ کم ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ لوگوں نے دین کی صحیح معرفت ہوجانے کی وجہ سے یہ سلسلہ بند کردیا ہے۔ بلکہ اس کی وجہ خود دین ہی سے بیزاری ہے۔

جب تک لوگوں کے سامنے صحیح اسلام اور صحیح فقہ کی مکمل تصویر کشی نہیں ہوگی لوگ اسی طرح کی احمقانہ اور مجنونانہ حرکات میں مبتلا رہیں گے۔ان احمقانہ مجالس ذکر میں اللہ کے کچھ اسماء حسنی کا ورد کیا جاتا ہے اور پھر وجد اور حال کا وہ مظاہرہ کیا جاتا ہے کہ یہ نام بھی شور و ہنگامہ کی نذر ہوجاتے ہیں۔ نہ اول کا پتہ ہوتا نہ آخر کا،صرف رقص اور اچھل کود باقی رہ جاتی ہے۔

میں نے وجد، حال اور استغراق کا یہ عجیب منظر سوڈان کے بالائی علاقہ میں جمعہ کی نماز کے بعد صوفیاء کے مختلف گروہوں کی دھما چوکڑی میں دیکھا۔ میں نے بوڑھوں کو اور جوانوں کو پسینے میں شرابور دیکھا۔ یہ پسینہ ان کی اچھل کود، دائیں بائیں بے محابہ جھومنے کی وجہ سے بہہ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ کچھ الفاظ بھی دہرا رہے تھے جسے وہ اللہ کا ذکر سمجھتے تھے مگر حقیقت تو یہ ہے کہ یہ اللہ کا ذکر نہیں بلکہ شریعت سے مکمل جہالت اور خدا اور اس کے بندے کے درمیان مکمل حجاب کا نمونہ تھا۔

مسجد میں برپا اس طوفان بدتمیزی کے بعد جب میں راجدھانی خرطوم کے مثلث میدان میں داخل ہوا تو وہاں پر انگریزوں کے بچوں کو بڑے بڑے اسٹور اور تجارتی مراکز چلاتے ہوئے دیکھا۔ دولت، خوشحالی، طاقت وقوت اور جمال ان کے آگے اور پیچھے تھا۔

میں نے افسوس اور شرمندگی سے سر ہلاتے ہوئے وارفتگی میں کہا "عرب غریبی سونے کی سرزمین پر محوِ خرام ہے"۔

میں نے اپنے آپ سے پوچھا، "کیا ہو جاتا اگر یہ نمازی جمعہ سے فراغت کے بعد خدا کی سرزمین میں منتشر ہو جاتے اور اللہ کا فضل تلاش کرتے جیسا کہ انھیں اللہ نے سورۂ جمعہ میں حکم دیا ہے؟"

جن لوگوں نے ان اذکار کو ایجاد کیا ہے انھوں نے مسلمانوں کو دوطرفہ طور سے گمراہ کیا ہے۔

ایک تو انھوں نے اللہ کی شریعت میں اس زہر قاتل کا اضافہ کر کے گمراہ کیا ہے اور دوسرے انھوں نے اللہ کے بندوں کو دوسرے نفع بخش کاموں سے روکا ہے جو ان کے دین اور دنیا دونوں کے لیے سودمند ثابت ہوتے۔

ہمارے ائمہ اسلاف نے شروع ہی میں جبکہ ان غلو شدہ اضافات کی تخم ریزی ہی ہو رہی تھی انھیں ناپسندیدہ قرار دیا تھا جبکہ اس دور میں ان کا خیر شر پر غالب تھا اور ان سے فائدہ ان کی مضرت سے زیادہ تھا۔

مشہور مورخ ابن کثیرؒ نے اسماعیل ابن اسحٰق سے روایت کی ہے کہ ایک روز مجھ سے امام احمدؒ ابن حنبل نے فرمایا کہ جب حارث محاسبیؒ تمہارے گھر آئیں تو مجھے مطلع کر دینا۔ میں نے کہا بہتر ہے۔ دراصل ان کی اس خواہش سے مجھے مسرت ہوئی تھی۔

اس کے بعد میں حارث کے پاس گیا اور کہا کہ آج کی رات تم اور تمہارے ساتھی میرے گھر پر پروگرام رکھو، اس نے کہا میرے ساتھی تو بہت ہیں، ان کے لیے کھجور اور شربت کا انتظام کر دینا۔

مغرب بعد یہ لوگ آئے۔ امام احمدؒ ان سے پہلے ہی آ کر ایک ایسے کمرے میں بیٹھ گئے تھے جس سے وہ تو انھیں دیکھ سکتے تھے اور ان کی باتیں سن سکتے تھے مگر وہ لوگ انھیں نہیں دیکھ سکتے تھے۔

عشا کے بعد ان لوگوں نے اور کوئی نماز نہیں پڑھی۔ دھیرے دھیرے یہ لوگ حارث کے آمنے سامنے آ کر بیٹھتے گئے بالکل خاموش، سر جھکائے ہوئے جیسے ان کے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہوں۔

آدھی رات کے بعد ایک شخص نے حارثؒ سے ایک مسئلہ دریافت کیا۔ حارثؒ نے اس مسئلہ پر بحث شروع کی اور پھر اس سے متعلق زہد، تقویٰ اور خوف خدا کا ذکر کیا۔ ہر طرف آہ وبکا اور گریہ وزاری شروع ہوگئی۔

یہ منظر دیکھ کے میں امام احمدؒ بن حنبل کے پاس گیا۔ وہ بھی اس قدر رو رہے تھے جیسے اب بیہوش ہوئے اور تب۔ صبح تک لوگوں کا یہی حال رہا۔

صبح کو جب لوگ واپس جانے لگے تو میں نے امام احمدؒ سے پوچھا اے ابو عبداللہ آپ نے ان لوگوں کو کیسا پایا؟ انھوں نے جواب دیا اس شخص کی طرح میں نے کسی کو زہد کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے نہیں دیکھا اور نہ ہی ان لوگوں جیسا میں نے دیکھا ہے۔ ان کا کوئی جواب نہیں۔ لیکن اس کے باوجود میری رائے یہی ہے کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نہ رہو۔

ابن کثیرؒ کہتے ہیں کہ امام احمدؒ ابن حنبل نے انھیں اس وجہ سے ناپسند کیا کہ ان کے کلام میں غلو تھا اور ان کے زہد میں خشونت وسختی تھی جو شریعت کا منتہائے مقصود نہیں ہے۔ اللہ نے بے محابا سختی اور بے جا موشگافی کا حکم نہیں دیا ہے۔

شاید یہی وجہ تھی کہ جب ابو زرعہؒ رازی نے حارث محاسبی کی کتاب ''الرعایۃ'' دیکھی تو اس پر بدعت کا حکم لگا دیا۔

پھر کتاب لانے والے شخص سے کہا تم امام مالکؒ، سفیان ثوریؒ، امام اوزاعی اور امام لیث کے راستہ پر چلو اور اسے بالکل چھوڑ دو۔

☆☆☆

یہ ہمارے ائمہ اسلاف کی رائے ہے، عبادات کے ان نت نئے طریقوں کے بارے میں جنھیں اس زمانے کے صوفیاء نے شروع کیا تھا۔ جب تصوف میں صرف غلو کا امتزاج تھا۔ اس میں جہالت پر مبنی خرافات شامل نہیں تھیں، جیسا کہ آج کل کا حال ہے۔

انصاف کی بات تو یہ ہے کہ آج کل، عوام ہوں یا خواص، ان کا طریقہ عبادت کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے مشہور ومعروف طریقوں سے کافی حد تک دور ہے۔

ذکر جس کے معنی یاد کرنے کے ہیں اس کی ضد نسیان یعنی بھول جانا ہے۔

جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ذکر کا تعلق دل سے ہے زبان سے نہیں۔

کبھی کبھی انسان کا قلب بیدار ہوتا ہے، اس کے حافظے میں کوئی چیز بہت ہی واضح طور سے آتی ہے مگر اس کے ہونٹوں میں ذرا بھی جنبش نہیں ہوتی یا اس کے جسم کا کوئی بھی حصہ حرکت نہیں کرتا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کا جسم جس قدر سکون سے رہے گا اس کا حافظہ اسی قدر تیزی سے کام کرے گا۔

بلکہ وہ جس قدر سکون کے ساتھ یادوں میں محو ہوگا اسی قدر تیزی کے ساتھ اس کے ذہن میں پرانی یادیں تازہ ہوں گی۔

زبان کی حرکت تو اس وقت شروع ہوتی ہے جب اس کے سامنے تصویر غیر یقینی اور دھندلی شکل میں ہوتی ہے۔

کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جو لفظ بھی نہیں بولتے مگر ان کے قلب اللہ کے ذکر سے معمور ہوتے ہیں۔ جبکہ کتنے لوگوں کی زبانوں پر ہمہ وقت اللہ ہی اللہ ہوتا ہے مگر ان کے دل اللہ کی طرف نہیں ہوتے یا کسی اور ہی سوچ میں غرق ہوتے ہیں۔ ان کا حال اس ٹیپ رکارڈر جیسا ہوتا ہے جو قرآن کی آیات تو سنتا ہے لیکن ثواب وعذاب سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔

بے شک اسلام میں کچھ اذکار ایسے ہیں جنھیں ایک مومن دل اور دماغ دونوں سے پڑھتا ہے۔

لیکن یہ ذکر نہ تو مکمل ہوتا ہے اور نہ ہی اوپر اٹھتا ہے جب تک کہ اس کی زبان دل کا ساتھ نہ دے اور دل کی بجھی ہوئی چنگاری کو ہوا نہ دے۔

صحیح حدیث سے بہت ساری دعائیں منقول ہیں جن کے پڑھنے سے ثواب عظیم ملتا ہے۔ لیکن ان ماثور دعاؤں کا مطمح نظر بالکل وہی ہے جو آج کے قومی ترانوں کا ہے تاکہ وطن کی عظمت کے گیت گا کر لوگوں کو وطن پر جان قربان کرنے کے لیے اکسایا جائے۔

ہر ملک کے طلباء اور عوام ان قومی ترانوں کے ذریعہ سے لوگوں میں وطن سے محبت اور وطن پر جان دینے کا جذبہ پیدا کرتے ہیں جو بلاشبہ قابل قدر ہے۔

لیکن ترانہ گانے والوں میں سے کوئی بھی یہ نہیں سمجھتا کہ اس کے تئیں وطن کی

خدمت بس اسی گیت کی چیخ و پکار تک محدود ہے خواہ اس کی یہ چیخ و پکار کتنی ہی خلوص سے کیوں نہ ہو۔

اگر وہ ایک طالب علم ہے تو اس کا اصل کام کلاس میں حاضری، کتابوں کا پڑھنا اور اچھا طالب علم بننا ہے۔

اسی طرح اگر وہ کسی کارخانہ میں ملازم ہے تو اسے پوری محنت اور ایمان داری کے ساتھ کارخانہ کے کاموں کو انجام دینا ہے۔

قومی ترانہ کا ان فرائض سے کیا لینا دینا ہے بلکہ یہ تو فرصت کے امور ہیں جنھیں اصل فرائض کے ساتھ ساتھ انجام دیا جاتا ہے۔

اگر کوئی طالب علم دن بھر اکیلے، دو کے ساتھ یا تین طالب علموں کے ساتھ صرف قومی ترانہ ہی گاتا رہتا ہے تو لوگ اسے دنیا کا احمق ترین لڑکا سمجھیں گے۔

اس طرح سے کچھ لوگوں نے اللہ کے دین میں ماثور دعاؤں اور وظائف کا سلسلہ شروع کیا ہے جن کے بلاشبہ عظیم معانی ہیں۔ ان میں اللہ کی تسبیح ہے، تحمید ہے، تقدیس ہے اور عظمت و جلالت ہے۔ ان سے ایک مسلم کا ضمیر بیدار ہوتا ہے اور اس کے قلب میں انشراح پیدا ہوتا ہے۔

ایک مسلمان کو ان دعاؤں پر مواظبت کرنی چاہیے تاکہ ان کی بدولت اس کی روح میں بالیدگی پیدا ہو۔

لیکن خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ ان کی مقررہ حد سے تجاوز کر جائے اور ہر وقت انہی کی تکرار کرتا رہے اور باقی کاموں سے بے نیاز ہو جائے۔

بلاشبہ یہ ایک عظیم کام ہے۔ ایک مسلمان کو یہ مسنون دعائیں پڑھنی چاہئیں، لیکن شرط یہ ہے کہ دوسرے فرائض اور واجبات میں کمی نہ ہو۔

اصل ذکر تو یہ ہے اور اسی ذکر کا بندوں سے مطالبہ بھی کیا جاتا ہے کہ خوشحالی کے وقت انسان اپنے رب کا شکریہ ادا کرے اور تنگی کے وقت صبر کرے۔

اگر وہ ان دونوں چیزوں کو فراموش کر جاتا ہے تو وہ بلاشبہ گھاٹے میں ہوگا۔

اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس طرح بیان کیا ہے:

لا تلهكم اموالكم ولا اولادكم عن ذكر الله ومن يفعل ذلك فاولئك هم الخاسرون. | تمہارے مال اور تمہارے اولاد تمہیں اللہ سے غافل نہ کر دیں اور اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو یہ لوگ گھاٹے میں ہوں گے۔

جی ہاں یہ لوگ گھاٹے میں ہوں گے خواہ ان کے ذکر کی بلند و بالا آوازیں پوری فضاء ہی کو پھاڑ کے کیوں نہ رکھ دیں۔

پھر ذکر کے ساتھ سمجھ اور غور و فکر ہونا چاہیے، دل اور زبان دونوں ہم آہنگ ہوں صرف زبان سے سو یا ہزار بار کی تکرار بے سود ہے۔

ذکر بھی ایک کلام ہے جو پورے جملہ کے ساتھ ہونا چاہیے تاکہ اس سے ایک معقول معنیٰ نکل سکے۔

اگر کسی کا نام عمر ہو تو کیا خالی عمر عمر کی تکرار سے کام چل سکتا ہے؟

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یا ایها الناس اذکروا نعمت الله علیکم. | اے لوگو! اپنے اوپر اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو۔

کیا اس حکم کی تعمیل کچھ نعمتوں کی تکرار سے ہو سکتی ہے کہ مثلاً روٹی روٹی یا گوشت گوشت کی تکرار شروع کر دے۔

لہٰذا اس طرح کی بات کرنا تو سراسر نادانی کی بات ہوگی۔ پھر اللہ تعالیٰ کے کلام کے ساتھ یہ ناروا سلوک کیوں کیا گیا۔ اس کے حکم کی قدر و منزلت بڑھانے کے بجائے الٹا اسے گھٹایا گیا۔

اس حقیقت کے باوجود یہ نام نہاد صوفیاء ادھورے کلمات پر رقص کرتے ہیں، اچھلتے کودتے ہیں اور پھر یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اللہ کا ذکر ہے۔

ہم کسی بھی شخص کو خواہ وہ کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو، یہ حق نہیں دے سکتے کہ وہ اللہ کے ذکر کے ساتھ کھلواڑ کرے اور پھر لوگوں کو بھی اس پر مجبور کرے۔

شریعت اسلامیہ نے تو اسے وقت اور تعداد سے بے نیاز چھوڑا تھا پھر یہ خاص وقت اور معین مقدار کی پابندی کہاں سے آگئی۔

شریعت نے تو ہر شخص کو آزادی دی ہے کہ وہ اپنی مخصوص ضروریات کے

مطابق تلاوت، دعا اور ذکر کرے پھر مخصوص اوقات اور مقررہ تعداد کی بات کہاں سے گھڑی گئی اور لوگوں کو اس کی پابندی کرنے پر مجبور کیا گیا۔

اس طرح کی قیود تو شعر و شاعری میں بھی برداشت نہیں کی گئیں پھر دین کے میدان میں اسے کہاں سے لایا گیا۔

عرب کے مشہور شاعر ابوالعلا المعری نے ایک دیوان لکھا جس کا نام ''لزوم مالا یلزم'' تھا۔ اس میں اس نے کچھ حروف کی پابندی کو ضروری قرار دیا تھا۔

لیکن عربوں نے اپنے چھوٹے بڑے قصیدوں میں اس پابندی کو روا نہیں رکھا۔ اس طرح المعری اپنی طرف سے عائد کردہ پابندی کا تن تنہا قیدی رہا۔ دوسرے شاعروں نے اس کی پابندی قبول نہیں کی۔

شعر و شاعری کے میدان میں تو اس طرح کی پابندی کو قبول نہیں کیا گیا لیکن دین کے میدان میں اس حماقت کو قبول کر لیا گیا۔

ارباب طریقت نے صبح و شام کے لیے کچھ مخصوص وظائف بنائے اور پھر انہیں فرض نمازوں کے ساتھ جوڑ دیا گیا۔ اس طرح اسے بھی دین کا ایک حصہ بنا دیا گیا۔

اس موقعہ پر آپ یہ نہ کہنے لگیں کہ ذکر تو اچھی چیز ہے اور ذکر کی کثرت کوئی خراب چیز نہیں ہے۔ جس پر اعتراض کیا جائے۔

بے شک ذکر اچھی چیز ہے اور ذکر میں کثرت اللہ کی حدود میں رہتے ہوئے ضرور ہونی چاہیے اور اس پر کسی مسلم کی طرف سے اعتراض کے بارے میں تو سوچا بھی نہیں جا سکتا۔

اللہ تعالیٰ کا ذکر صرف زبان سے کہنے یا اس کی تکرار کرنے سے کہیں زیادہ عظیم ہے، وہ ذکر جسے ذات خداوندی نے دین قرار دیا ہے اور جسے شرف قبولیت بخش کے عین عبادت قرار دیا ہے وہ اپنی تاثیر کی گہرائی میں اور ثواب کی عظمت میں ان اہل سلوک کی ایجاد کردہ رسموں سے کہیں زیادہ اعلیٰ وارفع ہے۔ یہ لوگ ارباب طریقت نہیں بلکہ طریقت میں فساد برپا کرنے والے ہیں۔

عبادات کی فرضیت، ان کے اوقات کے تعین اور مقدار وغیرہ میں خدائے بزرگ و برتر کی حکمت کارفرما ہے جس میں کسی انسان کی طرف سے کمی بیشی ہرگز

زیب نہیں دیتی۔

کسی چیز کی کثرت کو ایک اچھا کام سمجھ کے اور ایک دوا کے طور پر استعمال کرنا یا کرانا ظلم عظیم نہیں تو اور کیا ہے؟

اسپرین کی ایک یا دو گولی سر کے درد کے لیے مفید ہوتی ہے لیکن اگر خودکشی کا ارادہ ہو تو پوری شیشی زہر مار کر لیجیے۔

ہم نے اوراد وظائف کے شکار لوگوں کو علم و عمل کے میدان میں نکما پایا ہے اور ہم نے یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ ان کی وجہ سے صلاحیت اور پیداوار کے میدانوں میں بھی اسلام بہت پیچھے رہ گیا ہے۔

اس ذلت وخواری کی وجہ یہی ہے کہ پوری قوم نے حضورؐ کے طریقہ کو چھوڑ دیا ہے اور اس طرح وہ صراط مستقیم سے ہٹ گئے ہیں۔

عبادت کی حقیقت

سلوک یا طریقت پر بحث کرنے سے پہلے ہمیں ان اسباب اور عوامل پر نظر ڈالنی ہوگی جن کے بطن سے سلوک نے جنم لیا ہے۔

اخلاقی ماہرین جب سلوک کا ذکر کرتے ہیں تو وہ وراثت، ماحول اور اس کی غرض وغایت کا تذکرہ کرتے ہیں لیکن یہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔

یہاں ہم سلوک کے نفسیاتی پہلو پر بحث کریں گے۔ نفسیاتی اعتبار سے سلوک کسی زندہ انسان کے شعوری مظاہر میں سے تیسرا مظہر ہے۔ اور یہ شعوری مظاہر نفسیاتی علوم کے ماہرین کے مطابق ادراک، وجدان اور میلانات ہیں۔

کسی عمل کے پس پشت میلانات اور رجحانات کی جانکاری کے لیے اس کے سابقہ شعوری مظاہر کا جاننا ضروری ہے تاکہ آپ کی جانکاری مضبوط بنیادوں پر استوار ہو سکے۔

جو لوگ مختلف عبادات کو ایسے اعمال کے روپ میں دیکھتے ہیں جن میں باہم کوئی ربط واتحاد نہیں یا کسی شخص کی طرف سے محض واجبات کی ادائیگی ہے راضی خوشی یا زور زبردستی سے بالکل اسی طرح جیسے کہ ایک نوکر بازار سے سامان خرید کر اسے مالک

کے حوالہ کر دیتا ہے اور بس۔ اس طرح کے نقطۂ نظر والے لوگ دین کی اصل حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔

بہت سے عبادت گذار لوگ عبادت اس طرح کرتے ہیں جیسے وہ اپنے گرد و پیش سے ماورا کوئی چیز انجام دے رہے ہوں اور جن کی کیفیت سے ان کے دل و دماغ کلی یا جزئی طور سے خالی ہوتے ہیں۔

انصاف کی بات تو یہ ہے کہ جس عبادت کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور جس کے لیے سارے عالم کو پیدا کیا ہے وہ اس سے کہیں بلند و بالا چیز ہے۔

عبادت ایک شعوری عمل ہے جس میں بدن کے تمام عناصر شامل ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے عقل سے اس کی معرفت ہوتی ہے پھر وجدان کے ذریعہ اثر پذیری ہوتی ہے اور پھر سلوک کی طرف میلان پیدا ہوتا ہے۔ درحقیقت سلوک کی طرف میلان پہلی دونوں چیزوں کا ثمرہ ہوتا ہے۔

نماز، روزہ زکوٰۃ حسن اخلاق و کردار، حق گوئی اور دیگر تمام عبادات کی صحیح شکل یہی ہے۔ اسلام کی پہلی عبادت ہے اللہ کی صحیح معرفت۔ اس معرفت سے روشن عقل صحیح سلوک کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور پھر تمام معاملات کی بنیاد بنتی ہے۔

جب انسان کے قلب سے یہ صحیح معرفت ختم ہو جاتی ہے تو نہ تو اس کا دین ہی صحیح رہتا ہے اور نہ ہی اس کا اعلیٰ کردار باقی رہتا ہے۔

اللہ کی صحیح معرفت ان گناہوں کا وزن گھٹا دیتی ہے جن میں انسان مبتلا ہو جاتا ہے کیونکہ یہ گناہ یا تو عارضی ہوتے ہیں یا سطحی اور معمولی ہوتے ہیں۔

لیکن اللہ کے تئیں ناواقفیت اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کی مغفرت نہیں ہے اور نہ ہی اس کے ساتھ کوئی عمل قابل قبول اسی بات کو خدا تعالیٰ اپنی کتاب میں یوں فرماتا ہے۔

ان اللہ لا یغفران یشرک بہ ویغفر مادون ذلک لمن یشاء ومن یشرک باللہ فقد ضل ضلالا بعیدا۔

یعنی اللہ تعالیٰ شرک کرنے والوں کی مغفرت نہیں کرتا اور اس کے علاوہ جس کی بھی چاہے مغفرت کر دیتا ہے۔ اور اللہ کے ساتھ شرک کرنے والا دور دور تک گمراہی میں جا گرا۔

کیونکہ شرک اللہ تعالیٰ کے تعلق سے غلیظ قسم کی جہالت کی علامت ہے۔ کیا کسی شاندار عمارت میں رہنے والا احمق آدمی بھی یہ باور کر سکتا ہے کہ یہ عمارت اسی

میں موجود کیڑوں مکوڑوں نے کھڑی کی ہے۔

کیا یہ خرافات نہیں ہے جو باری تعالیٰ کے وجود کے مظاہر کو پتھروں حیوانوں اور انسانوں میں تلاش کیا جائے۔

قابل اعتبار معرفت تو وہ ہے جو اس کے انوکھے چشموں سے پھوٹے یعنی اللہ کے اعمال اور اقوال سے۔ اللہ کے اعمال سے مراد اس عالم کون و مکاں میں اس کی کرشمہ سازیاں ہیں اور اقوال سے مراد اس کی وحی۔ ان کے علاوہ معرفت حاصل کرنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

کسی ایسے بے وقوف شخص کو آپ عارف باللہ نہیں کہہ سکتے جو اس زمین و آسمان کے درمیان رہتا تو ہے لیکن اس کی پیدا کردہ نشانیوں پر کان نہیں دھرتا اور ان کے اسرار و رموز جاننے کی کوشش نہیں کرتا۔

جبکہ اللہ رب العزت ۔: اپنے رسولوں پر وحی بھیج کر صاف صاف یہ بتا دیا ہے کہ ایمان برحق اس کی کائنات میں صحیح غور و فکر اور اس کے وسیع آفاق میں عقل و خرد کے گھوڑے دوڑانے سے حاصل ہوتا ہے۔

ان فی خلق السموات والارض واختلاف الیل والنهار لآیات لا ولی الا لباب الذین یذکرون الله قیاما وقعود او علی جنو بهم ویتفکرون فی خلق السموات والارض ربنا ماخلقت هذا باطلا۔

بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور شب و روز کی گردش مین نشانیاں ہیں عقل مندوں کے لیے۔ جو لوگ اللہ کا ذکر کرتے ہیں کھڑے کھڑے، بیٹھ کر اور پہلوؤں کے بل اور سوچتے ہیں زمین و آسمان کی تخلیق کے بارے میں کہ اے ہمارے رب تم نے ان کو بیکار ہی نہیں بنایا ہے۔

اللہ کی معرفت تک لیجانے والے غور و فکر ہی میں اس کی عظمت کا راز پنہاں ہے اور یہی اس کے تقویٰ کی بنیاد بھی ہے۔ اسی واسطے غور و فکر کرنے والا یہ عقل مند شخص بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ اے اللہ تو تمام چیزوں سے منزہ ہے لہٰذا تو ہمیں عذاب جہنم سے بچا۔

ان ارباب عقل و خرد نے اللہ کی مخلوقات میں غور و فکر کیا جس کے نتیجے میں ان کے اندر اللہ کی خشیت پیدا ہوئی اور پھر انھوں نے اس کے غضب سے پناہ مانگی۔

اس لیے تقویٰ ذہنی کمزوری کی وجہ سے نہیں بلکہ ذہنی بالیدگی اور زندگی اور اس سے متعلق تمام اشیاء کے صحیح ادراک کا نتیجہ ہوتا ہے۔

ارشاد باری ہے:

انما یخشی الله من عباده العلماء. الله کے بندوں میں علماء ہی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔

اللہ کی معرفت میں گہرائی ہی اول ترین عبادت ہے اور اس کی وسیع و عریض کائنات میں غور و فکر کے ذریعہ اللہ کے بارے میں جاننا، اس کی نازل کتابوں میں دیے گئے اس کے حکم کی تعمیل ہے۔ مادی علوم سے استخراج کردہ نتائج کو بہر حال مادہ سے ماورا ذریعہ سے آنے والی وحی کے مطابق ہونا چاہیے، کیونکہ یہ اور وہ دونوں ہی اللہ کے پاس سے آئے ہیں۔ اسی لیے دین اور سائنس میں فرق یا تضاد کی باتیں کرنا ناسمجھی کی علامات ہیں، اس ناسمجھی کا شکار اہل دین اور اہل سائنس دونوں ہی ہوئے ہیں۔

سائنس کے میدان میں تو مسلسل تجربات جاری ہیں اور پچھلی بہت سی تحقیقات کو آج غلط ثابت کیا جا چکا ہے۔ ایسے میں ان لوگوں کا حال کیا ہوگا جنھوں نے جان بوجھ کر یا جذبات کی رو میں بہہ کر اپنے دین کو تباہ کرلیا۔

جہاں تک دینی علوم کا تعلق ہے تو میں مادی علوم کے تئیں اسلام کے موقف کو واضح کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ اس سلسلے میں تمام تحقیقات اور انکشافات نے اب تک ہمارے یقین و ایمان کو تقویت ہی بخشی ہے اور اللہ کی صحیح معرفت حاصل کرنے کے لیے قرآن نے ہمیں یہی طریقہ اختیار کرنے پر زور دیا ہے۔ معرفت کے اس اہم ترین ذریعہ سے بے توجہی برت کر مسلمانوں نے اسلامی تہذیب و تمدن کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس بے توجہی کے ذریعہ خود اپنے اوپر اور اپنے دین پر ظلم عظیم کیا ہے۔

اگر ہمارے اسلاف یونان کے نظریاتی فلسفہ کے بجائے اپنے دینی رجحانات کے ساتھ اس کائنات کے اسرار و رموز حل کرنے میں منہمک ہو جاتے تو یہ خود ان کے اور دیگر لوگوں کے لیے زیادہ نفع بخش ہوتا۔

صلاح صفدی نے لکھا ہے کہ جب خلیفہ مامون نے قبرص کے عیسائی حکمراں

سے صلح کی تو اس سے یونانی علوم وفنون پر مشتمل کتابوں کے ذخیرہ کو بغداد بھیجنے کی درخواست کی۔ اہل قبرص نے ان کتابوں کو ایک بڑے سے مکان میں جمع کر کے اسے مقفل کر دیا تھا۔ قبرص کے بادشاہ نے اس سلسلہ میں اپنے درباریوں سے مشورہ کیا۔ سب نے ان کتابوں کو بھیجنے سے منع کیا۔ لیکن ایک بوڑھے بطریق نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ ہمیں ان کتابوں کو ضرور بھیج دینا چاہیے کیونکہ یہ کتابیں جب بھی کسی اہل شریعت میں گئی ہیں ان کا ناس کر کے رکھ دیا ہے اور ان کے علماء کو باہم دست وگریباں کر دیا ہے۔

اس بوڑھے بطریق کی ایک ایک بات سچ ثابت ہوئی۔ ہمارے علماء نے ان علوم وفنون کو قرآن وحدیث کے ساتھ خلط ملط کر دیا اور پھر دین کو ان علوم اور ان علوم و فنون کے فاسد نظریات کے آئینہ میں دیکھنے لگے۔

پھر حالات نے مزید پلٹا کھایا اور یہی علوم اصل دین بن گئے۔ اب علماء انھیں کو کہا جانے لگا جو ان علوم وفنون میں تو ماہر ہوتے مگر قرآن وحدیث کا علم بہت ہی معمولی رکھتے۔ اس طرح یہ اساطیر اور خرافات کے شکار ہو کے رہ گئے۔

کسی کو عالم دین اس وقت تک نہیں کہہ سکتے جب تک کہ اسے اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ فرمودات کا علم نہ ہو۔ اسی طرح وہ عالم دین اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کون ومکاں کے رموز واسرار کا اسے کم یا زیادہ علم نہ ہو۔

یہ بات یاد رکھیے کہ زندگی اور زندہ لوگوں کے بارے میں معلومات کے مطابق ہی اسے خدا کی معرفت اور اس سے خشیت کا درجہ میسر ہوگا۔

☆☆☆

یہ معرفت بذات خود فضیلت وہ ایک صحیح راستے کی طرف رہنمائی کرتی ہے کیونکہ یہ انسان کو ایک ایسے سانچے میں ڈھال دیتی ہے۔ جس سے اس کی فکر اور عمل کو اوج اور کمال حاصل ہوتا ہے۔

جس نے خالق اور اس کی مخلوق کو پہچان لیا اس کا ہر عمل باعث کمال ہوگا اور زندگی کے ہر موڑ پر خطرات اور حوادث سے محفوظ رہے گا۔

اسلام اپنے متبعین کے لیے عمل صالح لازمی قرار دیتا ہے مگر اس نے ایک مسلم

سے متوقع عمل صالح کی کوئی حد بندی نہیں کی ہے۔

لہٰذا قرآن کی دسیوں آیات میں عمومی طور سے جن اعمال صالحہ کا ذکر کیا گیا ہے ان کی حیثیت ایک ضمیمہ کی ہے جن کا حقیقی ایمان کے ساتھ وجود ضروری ہے۔

عمل صالح دراصل وہ احسان ہے جس کا ذکر دیگر آیات میں کیا گیا ہے اور وہ بھی ان اقوام کے زعم باطل کی تردید میں جو یہ فرض کیے بیٹھے تھے کہ جنت پر تو ہماری اجارہ داری ہے اور ہمیں بہر حال مل کے رہے گی۔

وقالوا لن يد خل الجنة الامن كان هودا اونصارى تلك امانيهم قل هاتوا برهانكم ان كنتم صادقين، بلى من اسلم وجهه لله وهو محسن فله اجره عندربه ولا خوف عليهم ولاهم يحزنون ﴿البقرة:۱۱۱-۱۱۲﴾

اور ان لوگوں نے کہا جنت میں اور کوئی نہیں داخل ہوگا سوائے جو یہودی یا نصرانی ہو، یہ ان کی خام خیالی ہے۔ آپ کہہ دیجیے کہ اگر تم سچے ہو تو اس کی دلیل پیش کرو، بلکہ جو خالص اللہ کے لیے اسلام لایا اور وہ نیکی کرنے والا ہے تو اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے، نہ تو ایسے لوگوں کو خوف ہوگا اور نہ ہی غمگین ہوں گے۔

ایک دوسری جگہ یوں ارشاد فرمایا گیا ہے:

ليس باما نيكم ولا امانى اهل الكتاب، من يعمل سوء ا يجزبه ولا يجدله من دون الله وليا ولا نصيرا. ومن يعمل من الصالحات من ذكراو انثى وهو مومن فاولئك يدخلون الجنة ولا يظلمون نقيرا ومن احسن دينا ممن اسلم وجهه لله وهو محسن ﴿النسا:۱۲۳-۱۲۵﴾

نہ تو تمہاری تمناؤں سے کام چلے گا اور نہ ہی اہل کتاب کی آرزوؤں سے جو بھی برا کام کرے گا اسے اس کا بدلہ ملے گا اور اللہ کے علاوہ اس کا کوئی دوست اور مددگار نہیں ہوگا اور جو نیک کام کرے گا مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو وہ لوگ جنت میں جائیں گے اور ان پر رتی برابر بھی ظلم نہیں ہوگا۔ اور اس سے اچھا کس کا دین ہوگا جو خالص اللہ کے لیے مسلمان ہوا اور وہ اچھے کام کر رہا ہو۔

شریعت نے خاص خاص حالات میں جن عبادات کو لازمی قرار دیا ہے وہ بھی دراصل اس جامع اصلاح کا حصہ ہیں جنھیں اللہ نے اعمال صالحہ قرار دیا ہے۔ اسی بات کو اس طرح کہا گیا ہے:

فمن آمن واصلح فلاخوف عليهم ولاهم يحزنون.

جو شخص ایمان لایا اور عمل صالح کیا وہ نہ تو خوف زدہ ہوں گے اور نہ ہی غمگین ہوں گے۔

لہٰذا جو شخص دین کو خاص اعمال اور خاص جگہوں میں ادائیگی تک محدود رکھتا ہے وہ غلطی پر ہے۔

کسی شخص کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوگا جب تک کہ وہ سونپے گئے اعمال کو بحسن وخوبی نہیں بجالاتا۔

اسے تمام امور کو بحسن وخوبی انجام دینا ہے۔اس میں کمی کو وہ برا سمجھے اور اس سے بگاڑ کا خطرہ محسوس کرے۔

ایمان اور عمل صالح اس امت کے یہ دو تصور ہیں جن میں ہر پہلو سے خیر ہی خیر ہو اور کسی بھی نوعیت کا فساد یا خرابی نہ ہو۔

ایمان اور عمل صالح کی بدولت وہ اپنے اقتصادی اور سماجی امور کو عقل مندی، دور اندیشی، ذوق سلیم اور عقل رسا کے محور پر چلائے۔

کیونکہ صالح کا مطلب ہے فکر وعقل، ضابطہ اور نظام جس کی ضد ہے جذباتیت اور بے لگام خواہشات۔ جی ہاں اس کا تعلق دینی اور دنیاوی دونوں عملوں سے ہے۔

صبح سویرے نیند سے بیدار ہونے کے بعد ہی سے اسے مختلف پہلوؤں سے وابستہ مختلف کام انجام دینے پڑتے ہیں۔جن کاموں میں وہ مصروف رہتا ہے ان کے نقوش اس کی زندگی پر بڑے گہرے ہوتے ہیں۔

ایک مسلمان کا اللہ پر حق یہ ہے کہ وہ ان تمام امور کو بحسن وخوبی انجام دے خواہ وہ تاجر ہو، کسان ہو، کلرک ہو، اکاؤنٹنٹ ہو، ماتحت ہو یا مالک اور شاگرد ہو یا استاد۔

کسی کام کو انجام دینے کے لیے قائم کی جانے والی مشینری مختلف حالات میں کام کرنے کے لیے سازگار حالات مہیا کرتی ہے۔ایمان برحق احسان یا عمل صالح کی آبیاری کے لیے دل ودماغ کے لیے صالح ڈھانچہ تیار کرتا ہے۔

اسی لیے ہر مسلم پر یہ واجب ہے کہ وہ اپنی زندگی اور نفس دونوں کو پاکیزہ بنائے۔

ہمارے دین کو سب سے زیادہ نقصان اس وقت پہنچا ہے جب اسے چند مخصوص اعمال کے ساتھ جوڑ دیا گیا اور پھر یہ باور کرلیا گیا کہ ان اعمال کی ادائیگی سے فرض ادا ہوگیا اور اب کچھ اور نہیں کرنا ہے۔

اسی غلط تصور نے بہت سے متقی پرہیزگار لوگوں کی زندگیوں کو تلخ بنادیا ہے۔جو نماز

پڑھتے ہیں روزہ وغیرہ رکھتے ہیں لیکن زندگی کے دیگر معاملات میں بگاڑ کا شکار ہیں۔

اور اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ انھوں نے دنیاوی امور کو اچھی طرح انجام دیا ہے تب بھی ان سے کم ہی توقع کی جاتی ہے کہ وہ معاملات کے حسن وخوبی میں دوسروں کا مقابلہ کر سکیں۔

یہاں پر ہم ان کے نماز روزے کو موضوع بحث نہیں بنانا چاہتے۔ ہوسکتا ہے کہ ظاہری شکل وصورت میں ان کی عبادات صحیح ہوں۔

لیکن اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان کی دین داری ملاوٹی ہے اور ان کے دل ودماغ مریض ہیں۔ ان کے دل میں اصلاح کا امکان اب نہیں رہا۔

بلکہ یہ حقیقت ہے کہ ان کے قلوب میں اللہ کی معرفت ہی میں جھول اور کمی ہے کیونکہ قلب صالح تو روزمرہ کے معمولات کو بھی جلیل القدر عبادت میں تبدیل کر دیتا ہے۔

دنیاوی معاملات کو شمار میں نہیں لایا جا سکتا۔ اسی طرح زندگی کے مراحل بھی وسیع وعریض ہیں۔

لیکن ایک سچے مومن کی تو شان ہی نرالی ہوتی ہے۔ جب اس کا واسطہ ان معاملات سے پڑتا ہے تو وہ ان کو ایک عبادت بنا دیتا ہے بالکل اسی طرح جیسے ایک معدہ کھانے کو زندگی اور قوت میں تبدیل کر دیتا ہے۔

ارشاد ربانی ہے:

ولا ینفقون نفقة صغیرہ ولا کبیرة ولا یقطعون وادیا الا کتب لھم لیجزیھم اللہ احسن ماکانوا یعملون. ﴿توبة: ۱۲۰-۱۲۱﴾	اور یہ لوگ کم یا زیادہ جو بھی خرچ کرتے ہیں اور کسی وادی کو عبور کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے لیے اجر لکھ دیتے ہیں تاکہ اللہ ان کے اعمال کا بہترین بدلہ دے۔

ایک مومن کو تو لہو ولعب کے سامان پر بھی ثواب مل جاتا ہے بشرطیکہ اس کی نیت خیر کی ہو جب کہ یہ سب امور تو انتہائی سنجیدہ نوعیت کے ہیں۔

خاص خاص عبادات میں اعمال صالح کے انحصار کے باعث متقی حضرات انہی مخصوص عبادات کو بار بار دہراتے رہتے ہیں کیونکہ اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اسی مقصد کے پیش نظر یہ عبادات بار بار کی جاتی ہیں۔

ایک وقت کی عبادت سے فارغ ہوتے ہی دوسرے وقت کی عبادت شروع ہو جاتی ہے۔

اس موقع پر مشہور بزرگ شعرانیؒ کی کہانی خود انہی کی زبانی سنتے چلیں:

''عشاء کی نماز کے بعد میں ذکر خدا میں مشغول ہو جاتا۔ یہاں تک کہ صبح صادق طلوع ہو جاتی، نماز فجر کے بعد اشراق اور پھر چاشت تک ذکر کرتا۔ چاشت کی نماز کے بعد بھی بیٹھا رہتا۔ یہاں تک کہ ظہر کا وقت ہو جاتا۔ ظہر کے بعد پھر عصر تک ذکر کرتا۔ عصر کے بعد مغرب تک، مغرب کے بعد عشاء تک اور پھر صبح تک یہ سلسلہ برابر چلتا ہی رہتا۔

یہ سلسلہ اسی طرح تقریباً ایک سال تک جاری رہا۔ اکثر و بیشتر مغرب و عشا کے درمیان ایک چوتھائی قرآن کی تلاوت کرتا اور پھر باقی قرآن تہجد کی نماز میں ختم کرتا۔ کبھی کبھی تو صرف ایک ہی رکعت میں پورا قرآن ختم کر دیتا۔

نیند کے غلبہ سے ایسا لگتا جیسے سر ہوا میں اڑ رہا ہو اور پھر مدہوشی طاری ہو جاتی۔

بسا اوقات نیند کا غلبہ بہت ہی شدید ہوتا تو میں کوڑا اٹھا کے اپنی ران پر برسانے لگتا اور کبھی کبھی جاڑے کے موسم میں کپڑوں کو ٹھنڈے پانی سے تر کر لیتا تاکہ نیند مجھے مغلوب نہ کر سکے''

کیا یہ اسلامی طرز زندگی ہے؟ ہم اسے صرف اس وجہ سے ناپسند نہیں کرتے ہیں کہ اس میں غلو ہے اور سنت نبوی کے خلاف ہے جیسا کہ جمہور علماء کا خیال ہے۔

بلکہ ہم اسے اس وجہ سے بھی ناپسند کرتے ہیں کہ اطاعت کا مطلب ہرگز ہرگز یہ نہیں ہے کہ آدمی ہمہ وقت جبر و اکراہ کے ساتھ ذکر نماز اور تلاوت وغیرہ میں لگا رہے اور باقی کام چھوڑ دے۔

کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ایک انصاف پرور قاضی و حاکم جو لوگوں کے مقدمات کے فیصلہ میں شب و روز عرق ریزی کرتا ہے اللہ کی رضا جوئی اور خوشنودی حاصل کرنے میں اس کا درجہ اس عابدِ وزاہد سے کم ہے؟

کیا آپ یہ باور کرتے ہیں کہ جہالت کے خلاف شمشیر بکف استاد جو رات و دن ایک کر کے بچوں کو درس دیتا ہے اس کا درجہ اس عابد مرتاض سے کم ہے؟

ہرگز نہیں، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ صاف دل اور زندہ ضمیر والا قاضی اور مدرس

جو دن بھر جان لیوا مشقت و محنت کے بعد پوری رات سوتے رہتے ہیں ان کا درجہ ایسے عابدوں سے کہیں اعلیٰ واقع ہے۔

دراصل عبادت کا مطلب سمجھنے میں ہم سے غلطی ہوئی ہے۔ ہماری تہذیب و تمدن کی کیا کایا پلٹ ہوئی ہے۔ ہم نے جہالت کو علم سمجھ لیا اور علم کو جہالت اور یہی ہماری اس امت کی پس ماندگی اور تنزلی کا حقیقی سبب ہے۔

افسوس تو یہ ہے کہ پچھلے دنوں میں نے بہت سے دین پسند نوجوانوں کو اسی غلط راہ پر رواں دواں دیکھا ہے۔

امت اسلامیہ کے یہ دین پسند نوجوان کسی اسلامی جماعت سے وابستہ ہو کے پوری طرح تبلیغ، وعظ و نصیحت میں لگ جاتے ہیں اور پھر تفسیر، حدیث اور فقہ کی موٹی موٹی کتابیں پڑھنا شروع کر دیتے ہیں اور پھر نتیجہ کے طور پر وہ ایک ناکام ڈاکٹر یا کام چور انجینئر بن جاتے ہیں۔

آپ ہی فیصلہ کیجیے، کیا ایسا ڈاکٹر اپنے مقدس پیشہ سے انصاف کر پاتا ہے اسے یہ حقیقت کیوں نہیں معلوم ہے کہ اس کا ایک کامیاب آپریشن یا ایک مریض کا کامیاب علاج بھی عمل صالح ہے، جسے اسلام نے کامیابی کی شرط اور نجات کا ضامن قرار دیا ہے۔ آخر اسے بتایا کیوں نہیں جاتا کہ حسن نیت سے کیا گیا اس کا یہ عمل اللہ کے نزدیک نماز و زکوٰۃ سے کم پسندیدہ نہیں ہے۔

اب تو ہماری یہ عادت قدیم میراث بن چکی ہے کہ ہم شرعی علوم کو تو عزت و شرف کا مقام دیتے ہیں لیکن دنیاوی علوم کو بالکل بے کار اور لغو سمجھتے ہیں جبکہ ان دونوں علوم کی اللہ کی طرف رہنمائی اور اس کے دین کی خدمت کرنے میں یکساں اہمیت ہے۔

ہمارے اس باطل ورثہ نے ہم کو سودمند اور ثمر آور سائنسی علوم سے دور رکھا ہے۔ ابھی تک اہم ٹکنیکل کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مسلمانوں کا تناسب خطرناک حد تک کم ہے۔ جس کی وجہ سے ایجادات و تخلیقات کے میدان میں ہم تو پیچھے رہ گئے اور اغیار بہت آگے نکل گئے۔

فلسطین کے پہلے معرکہ میں جب عربوں کا واسطہ یہودیوں سے ہوا تو اسرائیل کی فوج میں ماہرین کا ایک ایسا دستہ بھی شامل تھا جو انجینئرنگ، اعداد و شمار،

کھیتی باڑی، بجلی، زمین کی طبیعت اور پانی کے ذرائع کے بارے میں پوری مہارت رکھتا تھا جس کی وجہ سے انھوں نے زمین کے ایک ایک بالشت کے بارے میں جامع منصوبہ تیار کیا۔

اسی مہارت، علم اور مکمل منصوبہ بندی کی بدولت انھوں نے سات عرب ملکوں کی متحدہ فوج سے مقابلہ کیا۔

ساتوں عرب ملکوں کو شکست ہوئی اور ان کی ساری اکڑفوں کافور ہوگئی۔ ان کی ساری لن ترانیاں اور شجاعت کی داستانیں مہارت، تجربہ علم اور سچائی کے مقابلہ میں ہیچ ثابت ہوئیں۔

یہ شکست صرف اس وجہ سے ہوئی کہ ہماری ثروت آدمیوں اور سامان حرب دونوں اعتبار سے ہمارے دشمن سے کم تر تھی۔

دینی جاہ وحشمت کے لیے دنیاوی جاہ وحشمت کا حصول ضروری ہے اور دنیاوی اسرار ورموز سے واقفیت حاصل کیے بغیر دنیا کی سیادت حاصل نہیں ہوسکتی۔

پروفیسر طٰہٰ عبدالباقی صحیح تصوف اور شعرانی کا دفاع کرتے ہوئے لکھتے ہیں، ''شعرانی نے عبادت اور کام دونوں کو یکجا کرنے کی بات کی ہے کیونکہ یہ دونوں ہی زندگی کا ستون ہیں اور انھوں نے بہت سی دلیلیں ایسی پیش کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل تصوف بلند درجات کے حصول کی خاطر دنیاوی عیش وعشرت کو تیاگ دیتے ہیں۔

شعرانی کے خیال میں اہل حرفت وصنعت کو عابدین پر فضیلت حاصل ہے کیونکہ ان سے عوام کو فائدہ پہنچتا ہے جبکہ ایک عابد صرف اپنے لیے عبادت کرتا ہے۔

شعرانی کے یہ الفاظ قابل غور ہیں:

کیا ہی اچھا ہوتا اگر ایک درزی اپنی سوئی کو تسبیح بنالے، ایک بڑھئی اپنے بنسلے کو تسبیح بنالے۔ یہ تو اللہ کے حضور بہت ہی سودمند اور مقبول تسبیح بن سکتی ہیں۔

اس کے بعد شعرانی مزید ایک قدم آگے بڑھ کر بدنی زندگی کو روحانی زندگی پر ترجیح دیتے ہیں کیونکہ جسمانی صحت کا اثر براہ راست معاش پر پڑتا ہے اور معاش کی تنگی سے آدمی کی فکری اور روحانی صلاحیت بھی مفلوج ہوکر رہ جاتی ہے۔

اسی نکتہ کے پیش نظر امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول بھی ملاحظہ کرتے چلیے:

''تم اس آدمی سے مشورہ نہ کرو جس کے گھر میں کھانے کے لیے آٹا تک نہ ہو''۔
یہ بہت ہی اچھا اور قابل قدر مشورہ ہے۔ اگر تصوف ایسی باتوں کو قبول کرتا ہے تو یہ عین اسلام ہے ورنہ بکواس اور خرافات۔

تقویٰ یہ نہیں ہے کہ تم دنیا چھوڑ دو۔ تقویٰ تو یہ ہے کہ دنیا تمہارے ہاتھ میں ہو اور جب دنیا تمہارے ہاتھ میں ہو اور تم اللہ کے بندے بنے رہو تو تم بھی اور جو کچھ بھی تمہارے ہاتھ میں ہے سب اللہ کے لیے ہوگا۔

دنیا سے فرار اختیار کرنے والے لوگ نہ تو مرد ہیں اور نہ ہی مومن ہیں۔

یہ تو بڑی سادہ لوحی کی بات ہوگی اگر کچھ لوگ یہ گمان کرلیں کہ اللہ کی طرف یکسوئی کے لیے یہ ضروری ہے کہ کچھ عبادات پر جم جائیں اور باقی چیزیں جوں کی توں چھوڑ دیں۔

بازاروں اور میدانوں میں کی گئی اللہ کی عبادت مسجدوں اور محرابوں سے کسی بھی طرح کم نہیں ہے۔

ہاں، یہ دنیا کوتاہ نظروں اور کم عقلوں کے لیے خطرہ بن سکتی ہے بالکل اسی طرح جیسے کچھ مریضوں کے لیے کھانا۔

اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ آپ تمام لوگوں کا ہی کھانا بند کردیں اور پھر کھانے کی مذمت میں پورا قصیدہ لکھ ماریں۔

یہ دنیا تو تنگ دلوں کے لیے خطرہ ہے لیکن اس کا خطرہ ان نمازیوں اور روزہ داروں سے زیادہ نہیں ہے جن کے دلوں میں نماز و روزہ سے غرور و تکبر پیدا ہو جاتا ہے یا وہ وضو تو کرتے ہیں مگر اپنے دلوں کو نہیں دھوتے اور اپنی نفسانی خواہشات کو لگام نہیں لگاتے۔

ایسے حالات میں ہماری جنگ ان عبادات کے خلاف نہیں ہے بلکہ ان سے فائدہ حاصل نہ کرنے کے خلاف ہے۔

یہی بات ہم ان لوگوں سے بھی کہتے ہیں جو آنکھ بند کر کے زندگی کی خواہشات کے پیچھے بھاگے جا رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے خود کو شیطان کے ہاتھوں بیچ دیا ہے۔ انھیں تو چاہیے تھا کہ اس دنیا کو رحمٰن کی عبادت کے

لیے غنیمت جانتے۔

احسان یا عمل صالح کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے ہاتھ میں جو کچھ بھی ہے اس سے اپنی زندگی سنواریے اور اس کا رشتہ خالق باری سے استوار کیجیے۔

عبادت کا وسیع تر مطلب یہی ہے اور اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ''آمنوا وعملوا الصالحات'' یعنی ایمان لائے اور عمل صالح کیا کو ستر بار سے زیادہ دہرایا ہے۔

جہاں تک شارع کی طرف سے فرض کردہ عبادت کا سوال ہے تو شریعت نے اس کی تعداد اس کی کیفیات اور اس کی ابتداء وانتہا کو پوری طرح بیان کر دیا ہے۔ ہمیں ان کو جوں کا توں قبول کرنا ہے۔ ان میں نہ تو ہم ردوبدل کر سکتے ہیں نہ ہی کمی زیادتی۔

اگر یہ عبادات شریعت کے بتائے ہوئے طریقے پر ادا کی گئیں تو یہ افراد اور جماعتوں دونوں کے لیے باعث خیر ثابت ہونگی۔

اور اگر ان کی شکل یا موضوع سے کھلواڑ کیا گیا تو اس کی بھلائی جاتی رہے گی اور پھر مفسدین اور ملحدین کو بے جا دخل اندازی کا موقع فراہم ہوگا۔

☆☆☆

جہاں تک عبادت میں وجدان کا تعلق ہے تو ہم نے اپنی کتاب ''فقہ السیرۃ'' میں تحریر کیا ہے کہ عبادت میں خشوع وخضوع کے اندر محبت اور پسندیدگی کا عنصر شامل ہوتا ہے جبر واکراہ کی کارفرمائی نہیں ہوتی۔

عبادات میں وجدان کے پہلو پر قدیم صوفیاء نے بڑی توجہ دی تھی۔ انھوں نے جذبات کی گرمی سے دلوں کا تعلق اللہ سے جوڑا اور پھر وفور شوق سے اس کی آبیاری کی۔ اس طرح انھوں نے فرض عبادات کو اس طرح بنا دیا جیسے کوئی دلکش موسیقی سن رہے ہوں۔

اسی لیے ہمارے قدیم صوفیاء، بیدار ضمیر، رقیق القلب اور صاحب فکر ونظر ہوتے تھے۔

انہی خوبیوں کی بدولت زمانہ ان کے پیچھے چلتا تھا اور اسلامی ملکوں میں ان کی تعلیمات کی پذیرائی ہوتی تھی۔

پھر تصوف میں دین کے ساتھ فلسفہ کی آمیزش ہوئی۔ اخلاقی مبادیات، نفوس کے امراض اور جماعتی روابط کی طویل تشریحات سامنے آئیں۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جذبات کی گرمی کی جگہ عقل نے لے لی اور اپنے مانوس محسوسات کے پیمانے میں اسلامی شعائر اور اس کے معارف کو ناپنے لگے جس کی ضرورت نہیں تھی۔

پھر انھوں نے حق و باطل میں تمیز کرنے کا فیصلہ اپنے ہاتھ میں لے لیا، کیونکہ شرعی قوانین کی تشریح وتعبیر کرنے والے فقہاء کو عوام میں وہ مقبولیت حاصل نہیں تھی، جو ان صوفیاء کو تھی۔ فقہاء کرام تو دین کی ظاہری صورت کے خدوخال نکھارنے میں مشغول تھے۔ یہ لوگ ہر قسم کے مباحث میں دلیل اور قاعدہ قانون کے پابند تھے، بالکل اسی طرح جیسے کہ ارسطو کی منطق کے لیے دلیلوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

ایسے ماحول میں جب کوئی شخص مسجد جا کے ان فقہاء کے حلقہ درس میں بیٹھتا تو اس کے کان ان نامانوس دلائل سے ناآشنا ہوتے۔ اس کے برخلاف جب وہ کسی شیخ کی محفل ذکر میں حاضر ہوتا اور وہ شیخ ذکر کے ساتھ گریہ وبکا کرتا تو اس کے دل و دماغ مین ترنگیں بجنے لگتیں خواہ اس شیخ کا ذکر اور رونا دھونا طبلہ کی چوٹ پر ہو یا بانسری کی لے پر۔

اسی وجہ سے فقہاء کی کساد بازاری ہوئی اور اصل فقہی علوم کو بھی زوال آیا لیکن اس زوال سے قبل فقہ میں بیرونی عناصر داخل ہو کے اسے کافی لاغر کر چکے تھے۔ اس کے برخلاف تصوف کو عروج ہوا اور تصوف کے ساتھ وجد وجذب، دھیان گیان اور پھر کشف و کرامات وغیرہ جنھیں سمیٹنے کے لیے شریعت اور عقل دونوں کا دامن تنگ پڑ گیا۔

آج امت اسلامیہ میں جو حالات پائے جاتے ہیں وہ ہماری انہی نسلوں کی دین ہیں جو اسلامی فقہ اور اسلامی روح دونوں سے محروم ہو چکی تھیں، جس کی وجہ سے پورا عالم اسلام عقل سلیم اور ذوق سلیم دونوں سے خالی تھا۔

اس امت اسلامیہ کا سب سے بڑا المیہ یہ ہوا کہ فقہاء کرام نے تربیت نفوس اور عبادات کے میدان کو خالی چھوڑ دیا اور صوفیاء نے علم اور شریعت کے میدان میں قدم نہیں رکھا۔

جبکہ اسلام کی اصل بنیاد ہی یہی چیزیں ہیں۔

اس کوتاہ دامنی کا نتیجہ یہ نکلا کہ نئی نئی اصطلاحیں اور نئے نئے معانی ومطالب پیدا کیے گئے جنھوں نے ہمارے دین اور ہماری امت دونوں کو بے پناہ نقصان پہنچایا۔

آدم متز اپنی کتاب ''اسلامی تہذیب وتمدن'' میں لکھتا ہے ''صوفی تحریک نے اسلام میں تین اصولوں کو جنم دیا، جنھوں نے مسلم سماج میں دوررس اثرات چھوڑے، ایک اللہ پر مکمل بھروسہ، دوسرا اولیاء اللہ پر پورا اعتقاد اور تیسرا حضور کی عظمت وجلالت، ان تینوں چیزوں کا آج بھی اسلامی امت پر کافی اثر ہے۔

اور شاید تصوف کی اسی مقبولیت وبرتری نے علماء وقت کو اس کا دشمن بنائے رکھا''۔

آدم متز کی یہ بات قطعی بے وزن ہے کیونکہ اللہ پر بھروسہ اور اس کے رسول کی عظمت تو شروع ہی سے مسلمانوں میں موجود رہی ہے پھر صوفیاء نے ان میں کون سی نئی بات پیدا کر دی؟

ہاں، اس کی دوسری بات بلاشبہ صحیح ہے۔ اولیاء پر اندھے اعتقاد نے جس کا تصور ان صوفیا نے پیدا کیا اس امت اور اس کے دین کا تیاپانچہ کر کے رکھ دیا۔

اس یورپی جھوٹ میں دو صحیح باتوں کو بڑی چابکدستی سے ملا دیا گیا ہے کہ اس میں جان پیدا ہو جائے اور اس طرح حق اور باطل کو خلط ملط کر کے بیان کیا جائے اور پھر توحید کے اندر شرک کی آمیزش کر دی جائے۔ ہوسکتا ہے کہ اس یورپی مفکر کا اللہ پر بھروسہ سے مراد وہ توکل رہا ہو جس کا مطلب ہو کام دھام چھوڑ کے اللہ کے بھروسے آدمی بیٹھ جائے۔ اگر اس کی مراد یہی ہے تو یہ بھی جاہل صوفیا کے دماغ کی اختراع ہے جس سے ہمارے قدیم اسلاف مبرا ہیں۔

شاید اس یورپی مفکر کی مراد اللہ پر کامل بھرسہ سے یہی باطل توکل ہی رہا ہو جیسا کہ سیاق وسباق سے پتہ چلتا ہے۔

ابن خلدون نے صوفیا کے بارے میں لکھا ہے:

''صوفیت کا مطلب ہے اپنے آپ کو عبادت کے لیے وقف کر دینا۔ اللہ عزوجل کی طرف لو لگانا، دنیا کی زیب وزینت سے منہ موڑ لینا اور دنیاوی عیش وعشرت، مال ودولت اور جاہ وحشمت سے کنارہ کشی۔

صحابہ کرام اور ہمارے سلف صالحین میں یہی خوبیاں تھیں۔ پھر دوسری صدی ہجری اور اس کے بعد لوگوں نے جب دنیا سے پینگیں بڑھانی شروع کیں تو دنیا سے ناطہ توڑ کے اللہ سے لو لگانے والوں کو صوفیا کہا جانے لگا"۔

ابن خلدون کے اس کلام میں بھی بہت زیادہ جھول ہے۔ گذشتہ صفحات میں آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ دنیا اور اس سے کنارہ کشی، زہد و رہبانیت اور مال و اسباب کے بارے میں اسلام کا موقف کیا ہے۔

مسلمانوں کو یہ حقیقت ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ دین کو دنیا کی ضرورت بالکل اسی طرح ہے جیسے روح کو بدن کی۔ ہر وہ تعلیم جو مسلمانوں کو مادی طور سے کمزور کر کے غیروں کو طاقتور بنائے وہ اللہ اور اس کے رسول سے خیانت پر مبنی ہے۔ اگر آپ اسے قلبی خیانت نہیں کہہ سکتے تو یہ عقلی خیانت ضرور ہے۔

قرآن کریم نے اقتصادی اور فوجی جہاد دونوں کو برابر قرار دیا ہے۔ اور دونوں میدانوں کے مجاہدین کو فرائض کی ادائیگی میں بھی رخصت دی ہے۔

حضرت سعد ابن وقاصؓ میدان جنگ میں ایک ہی رکعت وتر پڑھتے تھے۔

ارشاد باری ہے:

واللہ یقدر الیل و النھار، علم ان لن تحصوہ فتاب علیکم فاقرؤا ماتیسر من القرآن، علم ان سیکون منکم مرضی و آخرون یضربون فی الارض یبتغون من فضل اللہ وآخرون یقاتلون فی سبیل اللہ فاقرء واماتیسر منہ ﴿مزمل: ۲۰﴾

رات و دن کا پورا اندازہ اللہ ہی کو ہے۔ اسے معلوم ہے کہ تم (اس تقدیر وقت) کو ضبط نہیں کر سکتے سو اس نے تم پر مہربانی کی لہٰذا جتنا قرآن پڑھنا تمہارے لیے آسان ہو اتنا ہی پڑھو۔ وہ جانتا ہے کہ تم میں بعض بیمار بھی ہوں گے، بعض دوسرے زمین پر چل پھر کے روزی بھی تلاش کریں گے اور کچھ دوسرے اللہ کی راہ میں جہاد بھی کریں گے تو جتنا آسان ہو اتنا ہی پڑھ لو۔

علم اور عمل کا امتزاج جب حق کے لیے ہوتا ہے تو وہ ایک عبادت بن جاتا ہے جس کی اہمیت نماز اور تلاوت قرآن سے کم نہیں ہوتی۔

مجھے نہیں معلوم کہ وہ پیغام کیسے کامیاب ہو سکتا ہے جس کے علمبردار دنیا کی ساری قوموں سے کم تر ہوں یا جس قوم کے افراد یہ سمجھتے ہوں کہ تسبیح پکڑنے والے تو

اللہ کے بندے ہیں لیکن پھاوڑا اور ہتھوڑا پکڑنے والے صرف اپنے نفس کے بندے ہیں اور کچھ نہیں۔

حضورؐ کے ساتھی مکہ میں یا مدینہ میں امور زندگی کے تعلق سے مکہ یا مدینہ کے غیر مسلموں سے کسی بھی طرح کم نہیں تھے۔

بلکہ انھوں نے تو جنگی ضرورت کے پیش نظر خندق وغیرہ کھود کے حیلہ و تدبیر کے میدان میں ان سے برتر ہونے کا ثبوت دیا تھا۔

اہل عرب جب اسلام لائے اس وقت وہ مردانگی یا وسائل میں دوسروں سے فروتر نہیں تھے۔

بہت سارے معاملات میں وہ برابر تھے۔ لیکن عربوں میں نئے دین کا جوش و خروش تھا جس نے ان کے اندر بہادری اور شوق شہادت کی روح پھونک دی تھی۔ لیکن آج کے مسلمانوں کا تو معاملہ ہی دگرگوں ہے۔ وہ علم، صنعت وحرفت، تہذیب و تمدن، کھیتی باڑی یہاں تک کہ گائے بکریوں کے چرانے تک میں سب سے پیچھے ہیں۔ یہی حال دینی معاملات میں بھی ہے۔ طرح طرح کی بدعات وخرافات نے انھیں قدیم راستہ سے جو بلاشبہ صراط مستقیم تھا ہٹا دیا ہے۔ وہ طرح طرح کی بدعات میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ ان میں سے کچھ کا تذکرہ ہم کر رہے ہیں۔

مساجد کی سجاوٹ

اللہ کی عبادت کے لیے کوئی خاص جگہ متعین نہیں کی گئی ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے "اتق اللہ حیثما کنت" اللہ سے ڈرو جہاں بھی ہو۔ ایک دوسری حدیث میں کہا گیا ہے، "جعلت لی الارض مسجد او طھورا" یعنی میرے لیے زمین کو سجدہ گاہ اور پاک بنا دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یا عبادی الذین امنوا ان ارضی واسعۃ فایای فاعبدون۔
﴿عنبکوت:۵٦﴾

اے میرے بندو! جو ایمان لائے ہو میری زمین وسیع ہے لہٰذا میری ہی عبادت کرو۔

پھر حضورؐ نے یہ بھی ہدایت فرمائی ہے کہ نوافل کو گھر میں پڑھا جائے تا کہ یہ نمازیں گھر کی رونق اور نور بن جائیں۔

اس طرح عبادت کے سلسلے میں اللہ نے اپنے بندوں کو آسانی بہم پہنچائی ہے۔ شریعت نے کسی خاص جگہ کے تعین سے روکا بھی نہیں ہے بلکہ فرائض کی ادائیگی کے لیے مسجد ہی میں حاضری پر زور دیا ہے تا کہ اس کے صحن میں زندگی کی لہر پیدا ہو اور سب بھائی مل کر خلوص نیت کے ساتھ اپنے رب کو یاد کریں اور اس کے عذاب سے پناہ مانگیں۔

جب مومن اپنے بھائی بندوں کو رواں دواں جماعت کی طرف جاتا ہوا دیکھتا ہے تو اس کے اندر بھی حق پرستی کا جذبہ اٹھتا ہے اور پھر جماعت کی وجہ سے کمزوری اور ضعف کا جذبہ یا وسوسہ بھی جاتا رہتا ہے۔

اسی لیے مسجد کی چہل پہل اور اس کا بھرا ہونا تقویٰ کی نشانیوں میں سے ہے اور مسجد سے محبت اللہ سے محبت کی علامت ہے۔ مسجد کی طرف آمد و رفت گناہوں کا کفارہ ہے، نیکیوں میں زیادتی ہے اور درجات میں بلندی ہے۔

اس لیے مساجد نہ تو زیب و زینت کی جگہیں ہیں اور نہ ہی انجینئرنگ کا یادگار شاہکار ہیں۔ اس کی بناوٹ اور عمارت میں بے جا تکلف، فضول خرچی اور فخر و مباہات نہیں ہونا چاہیے۔

روایتوں میں مذکور ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے ایک مسجد کی تعمیر کا حکم دیا تو معمار سے کہا ''لوگوں کو بارش سے بچاؤ اور خبردار اسے لال اور پیلی نہ بنانا''۔

اسی طرح حضورؐ کی بھی مسجد تھی۔ کمال سادگی کا نمونہ۔

مسجد کی توسیع میں کوئی مضائقہ نہیں تا کہ ہزاروں لوگ اس میں نماز پڑھ سکیں اسی طرح اس کی قلعہ جیسی ضخامت میں بھی کوئی حرج نہیں ہے، یہ تو ضرورت کے تحت ہے۔

اسراف اور فضول خرچی جب ہے جبکہ مسجدوں کو پرکشش جاذب نظر اور عظیم الشان بنا دیا جائے۔

عالم اسلام میں یہ بدعت دوسروں کی عبادت گاہوں کی دیکھا دیکھی شروع

ہوئی تھی۔ دوسری قومیں اپنی عبادت گاہوں کو خوب مزین کرتی ہیں ان کو سنوارتی ہیں اور خوب رنگ وروغن کرتی ہیں۔

لیکن ہمارا معاملہ تو دوسرا ہے۔ ہمیں اسلام کی روح کو برقرار رکھنا ہے۔ مسجد کی بنیاد تو خالص تقویٰ پر ہوتی ہے اور تقویٰ کی بنیاد سادگی پر ہے۔

قبروں پر مساجد

اولیاء اللہ کی قبروں پر مساجد بنانے کا کافی رواج ہے۔ یہ ان کی یادگار، اللہ کی بارگاہ میں تقرب حاصل کرنے اور پھر ان کی محبت اور ان کے زیر سایہ رہنے کے لیے کیا جاتا ہے۔

جبکہ قرآن وسنت میں ایسا کرنے سے منع کیا گیا ہے اور ایسا کرنے والوں پر وعید کی گئی ہے۔

قبروں پر مساجد تعمیر کرنے سے کہیں بہتر یہ ہوتا کہ یہ لوگ متوفی کے لیے دعائے مغفرت کرتے، اللہ کے مقرر کردہ حدود کی پاسداری کرتے اور اللہ کے احکامات کی خلاف ورزی نہ کرتے۔

دراصل یہ بدعت مسلمانوں میں تحریف شدہ عیسائیت سے آئی ہے۔

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ حضرت ام سلمہؓ نے حضورؐ سے ایک کلیسا ماریا کا تذکرہ کیا جسے انھوں نے حبشہ میں دیکھا تھا۔ انھوں نے اس کلیسا میں جو کچھ بھی دیکھا اس کا ذکر کیا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا، ''وہ ایسی قوم ہیں کہ جب ان کا کوئی نیک شخص فوت ہو جاتا تو اس کی قبر پر مسجد بناتے اور پھر اس میں تصویریں بناتے۔ یہ لوگ خدا کی بدترین مخلوق ہیں''۔

نصرانیوں میں یہ بدعت قدیم بت پرستی کے راستہ داخل ہوئی۔ ابن جریر نے حضرت ابن عباسؓ اور دیگر سلف سے روایت کی ہے کہ ود، سواع وغیرہ جن بتوں کا قرآن نے سورۂ نوح میں تذکرہ کیا ہے یہ درحقیقت حضرت نوحؑ کی امت کے نیک لوگ تھے۔ جب ان لوگوں کی وفات ہوگئی تو لوگ ان کی قبروں پر بیٹھنے لگے۔ پھر ان کے بڑے بڑے مجسمے بنائے گئے پھر چند نسلوں کے بعد لوگ ان کی پوجا کرنے لگے۔

اس طرح بت پرستی کی بنیاد پڑی۔

اس فتنہ کا سدباب کرنے ہی کے لیے حضورؐ نے مسلمانوں کو ایسا کرنے سے سختی کے ساتھ منع فرمایا۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ وہ اپنے وفات شدہ لوگوں سے ہاتھ جھاڑ لیں، اپنی زندگی اپنے بل بوتے پر گذاریں اور کسی بھی زندہ یا مردہ شخص پر تکیہ نہ کریں۔

کیونکہ انسان کا سامنا جب اس کے رب سے ہوگا تو صرف اس کے صالح اعمال ہی اس کے کام آئیں گے اور کچھ بھی نہیں۔

اس سلسلہ میں حضورؐ کا ارشاد گرامی ہے:

لا تصلوا الی القبور و لا تجلسوا علیه.

قبروں کی طرف رخ کر کے نماز نہ پڑھو اور نہ ہی اس پر بیٹھو۔

دوسری حدیث میں یوں فرمایا ہے:

الارض کلها مسجد الا المقبرة و الحمام.

زمین پوری سجدہ گاہ ہے سوائے مقبرہ اور حمام کے۔

تیسری جگہ یوں فرمایا گیا ہے:

لعن الله الیهود و النصاری اتخذوا قبور انبیا ئهم مساجد الا لا تتخذوا القبور مساجد، انی انهاکم عن هذا.

یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو، انھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو مسجد بنا لیا، خبردار! تم لوگ قبروں کو مسجد نہ بنانا، میں تم کو اس بات سے روکتا ہوں۔

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے:

لعن زائرات القبور و المتخذین علیها المساجد و السرج.

قبر کی زیارت کرنے والی عورتوں اور جو ان پر مساجد بناتے ہیں اور چراغ جلاتے ہیں ان پر لعنت فرمائی ہے۔

حضورؐ نے بہت ہی واضح الفاظ میں قبروں کو پختہ بنانے اور ان پر کچھ تعمیر کرنے سے منع فرمایا ہے۔

حضرت معرور بن سوید بیان کرتے ہیں کہ میں نے مکہ کے راستے میں حضرت عمرؓ کے ساتھ صبح کی نماز ادا کی۔ انھوں نے اس میں الم تر اور لایلاف قریش کی سورتیں پڑھی۔ نماز کے بعد انھوں نے دیکھا کہ لوگ ادھر اُدھر جا رہے ہیں۔ انھوں

نے دریافت کیا کہ یہ لوگ کہاں جارہے ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ اے امیر المومنین یہاں قریب ہی ایک مسجد ہے جس میں حضورؐ نے نماز ادا کی تھی۔ یہ لوگ وہیں جا کے نماز پڑھیں گے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اس طرح کے عمل سے تم سے پچھلی امتیں ہلاک ہو چکی ہیں۔ وہ لوگ اپنے انبیاء کے آثار کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے انھیں کلیسا اور عبادت گاہیں بناتے تھے۔ لہٰذا جسے ان مساجد میں نماز پڑھنے کا اتفاق ہو وہ پڑھ لے اور جس کا اتفاق نہ ہو وہ اپنا کام کرے اور وہاں کا ارادہ نہ کرے۔

حضورؐ نے اپنے رب سے دعا مانگی تھی کہ اے اللہ میری قبر کو جشن منانے کی جگہ نہ بنانا کہ کسی خاص تاریخ اور وقت پر لوگ وہاں پر جوق در جوق آئیں۔

دین کی حقیقت سے باخبر اور پھر انسانی فطرت سے باخبر لوگ قبروں کو مساجد نہ بنانے کی حکمت کو بخوبی جانتے ہیں۔

مذکورہ بالا نصوص کی خلاف ورزی بلکہ ان میں تحریف کرنے والوں کی بس ایک ہی دلیل ہوتی ہے اور وہ ہے خیر و برکت کا حصول لیکن افسوس صد افسوس یہ مفروضہ برکت جلد ہی ان فوت شدہ بزرگ کی تقدیس میں تبدیل ہو کر دعاؤں اور منتوں کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اور پھر یہ معاملہ یہیں پر نہیں ختم ہوتا مشکلات اور مصائب کے وقت ان سے رو رو کے اور گڑگڑا کے مدد مانگی جاتی ہے۔

اگر یہ خالص شرک نہیں ہے تب بھی صرف ایک چھلانگ کی دیر ہے۔ ان کے حامی خواہ کچھ بھی تاویل و توجیہ پیش کریں۔

میں نے دسیوں لکھے ہوئے معروضات دیکھے ہیں جنھیں امام شافعیؒ کی قبر پر رکھا جاتا ہے یا انھیں ڈاک سے بھیجا جاتا ہے۔

اسی طرح حضرت امام حسینؓ کی قبر پر سیکڑوں نوجوان بے وقوفوں کو گرمجوشی کے ساتھ سرگوشیاں کرتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔

مگر ان دونوں سے کہیں زیادہ بے وقوف تو وہ جاہل صوفیا اور معرفت کے خود ساختہ دعویدار بہروپیے ہیں جو لوگوں کو بے وقوف بنا کر ایسا کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔

ان سب خرافات کا بس ایک ہی علاج ہے اور وہ ہے مسلمانوں میں تعلیم عام کی جائے تا کہ ان کے دل و دماغ کو جلا حاصل ہو اور وہ حقیقت و خرافات میں

تمیز کر سکیں۔

مصر کا فتویٰ

میں اس موقع پر اس سرکاری فتوی کا تذکرہ کرنا مناسب سمجھتا ہوں جسے ہندوستان کی کچھ اسلامی تنظیموں نے مصر کے وزیر اوقاف فضیلت مآب شیخ احمد حسن باقوری سے پوچھا تھا۔ اس فتویٰ میں یہ دریافت کیا گیا تھا کہ:

''کیا قبروں کو مزین کرنا اور اس پر روضہ بنانا جائز ہے؟''

''کیا قبر کے ساتھ سبیل، مسجد یا گیسٹ ہاؤس وغیرہ بنانا جائز ہے؟''

''قبروں کی گل پوشی یا اہم دینی مواقع پر اسے منور کرنا جائز ہے؟''

اب ذرا عزت مآب شیخ باقوری کا جواب بھی سنتے چلئے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''قبروں کو مزین کرنا، اس پر مزار بنانا بت پرستی اور شخصیت پرستی کی ایک شکل ہے جو اسلام میں ممنوع ہے اور حضورؐ نے اسے ترک کرنے کی نصیحت کی ہے۔

حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ:

نھی رسول اللہؐ ان یجصص القبر وان یقعد علیه وان یبنیٰ علیه۔ — حضورؐ نے قبر کو پختہ بنانے اس پر بیٹھنے اور اس پر تعمیر کرنے سے منع فرمایا ہے۔

اگر آج کل مسلمان قبروں کو فخر و مباہات کے لیے مزین کرتے ہیں اور پھر قبر کو مزار بنا کے یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ متوفی اللہ کا ولی تھا یا فلاں اور فلاں کی نسل سے تھا اور پھر اس تعلق کے ڈانڈے وہ دین سے ملا دیں تو ان کا یہ فعل حرام در حرام کہا جائے گا۔

جہاں تک قبر سے ملحق سبیل، مسجد یا گسٹ ہاؤس وغیرہ کا تعلق ہے تو اسلام قبرستان میں تنگی پیدا کرنے اور اس میں بھیڑ بھاڑ پیدا کرنے سے روکتا ہے۔

یہ مسئلہ تو اس وقت ہے جب یہ تعمیرات نجی زمین پر کی جائے لیکن اگر یہ زمین مسلمانوں کے عام مدفن کی ہو تو اس میں قبروں کے علاوہ کوئی بھی چیز بنانا حرام ہے۔

☆☆☆

جہاں تک قبر پر روشنی کرنے کا سوال ہے تو اس کا دین سے کوئی لینا دینا نہیں

ہے۔قبر میں روشنی تو میت کے نیک اعمال سے ہوگی۔ان بیرونی قندیلوں،موم بتیوں یا جھاڑ فانوس جسے زندہ متمول لوگ لگاتے ہیں ان سے مردہ کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

اسلامی نظریہ

فضیلت مآب باقوری اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں، ''اسلام جب زندوں میں مساوات کا قائل ہے تو بھلا مردوں کے درمیان عظیم الشان مقبروں اور شاندار مظاہر کے ذریعہ تفریق کی اجازت کیسے دے سکتا ہے۔

پھر اسلام کے نزدیک قبر کی زمین میت کے لیے وقف ہے۔اسی وجہ سے قبر جیسی شکل بنائی جاتی ہے تا کہ زندہ لوگ اپنے مردہ بھائی کی جگہ اسی طرح چھوڑ دیں جس طرح اس نے یہ دنیا چھوڑ دی ہے اور ایک چھوٹے سے گڑھے میں مقیم ہو گیا ہے۔

ایسے میں اگر چند مالدار لوگ اپنے مردوں کے لیے شاندار مزار اور قبے بناتے ہیں،ان میں باغات اور پیڑ پودے لگاتے ہیں اور چراغاں کرتے ہیں تو یہ سب کام اسلامی ہرگز نہیں ہو سکتے۔

بلکہ اللہ تو ان کی فضول خرچی اور مال کے بے جا استعمال کا محاسبہ کرے گا۔ان سے اللہ تعالیٰ اس جرأت اور فریب خوردگی کے بارے میں بھی سوال کرے گا۔

اللہ کی زمین میں مزارات اور مقبرے وغیرہ بنا کے ان میں عرس وغیرہ کی محفلیں نعت ومنقبت کے ہنگامے وغیرہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں ایک جرأت نہیں تو پھر اور کیا ہے؟

اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اس طرح کے مقبرے وغیرہ تعمیر کر کے وہ نماز،روزہ حج زکوۃ وغیرہ کی کمیوں کو پورا کرے گا تو وہ خام خیالی میں مبتلا ہے۔

کیا اس طرح کے عالی شان مزارات اور مقبرے وغیرہ بنا کے یہ لوگ دوسرے مردوں کی توہین نہیں کرتے ہیں۔

ہم نے مصر میں بذات خود دیکھا ہے کہ لوگ رسولؐ اللہ کے جلیل القدر صحابہ جیسے حضرت عمرؓو ابن العاص اور حضرت عقبہؓ بن نافع کی قبروں پر کم جاتے ہیں مگر بزرگوں کے اونچے اونچے مزاروں پر ان کی بھیڑ جمع رہتی ہے۔حالانکہ یہ اولیاء صحابہ

کرامؓ کے مقابلے میں پاسنگ کے برابر بھی نہیں ہو سکتے۔
یہ بات صرف مصر ہی کی نہیں ہے بلکہ تمام عالم اسلام کی ہے۔ بیرونی استعمار نے مسلمانوں کی یہ کمزوری سمجھ لی تھی اور اس نے اس کا خوب خوب فائدہ اٹھایا۔

مساجد کا کردار

نماز باجماعت ایک عبادت اور ایک ثواب کا کام ہے جس کے لیے ہر مسلمان جدو جہد کرتا ہے تاکہ آخرت میں اس کا پھل ملے۔
خواہ وہ مسجد میں کسی امام کے اقتدا کرتا ہو یا وہ بذات خود امامت کرتا ہو۔
درحقیقت امامت کوئی ایسا عمل نہیں جسے اجرت کے ترازو سے تولا جائے خواہ یہ اجرت کم ہو یا زیادہ۔
لیکن اس امت کے دنیاوی اور دینی مصالح اس بات کے مقتضی ہیں کہ یہ کام کچھ مخصوص افراد انجام دیں اور وہ بھی کل وقتی طور سے۔
یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ولایت، تعلیم، انتظامیہ اور قضا کو عام عبادات قرار دیتے ہوئے ان کاموں کے لیے باصلاحیت اور تجربہ کار اشخاص کا انتخاب ضروری قرار دیا ہے۔
اب یہ اسٹیٹ کا کام ہے کہ انھیں اتنی مناسب اجرت دے کہ وہ دیگر پیشوں سے کمائی سے بے نیاز ہو جائیں۔
آج کل ہر مہذب سماج کا یہی دستور ہے خواہ اس کی بنیاد مذہبی بنیادوں پر قائم ہو یا کسی اور بنیاد پر۔
چونکہ مسلمانوں کے یہاں مسجد کو بہت ہی کلیدی اہمیت حاصل ہے اس لیے ان کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ دینا کسی بھی طرح مناسب نہیں ہوگا۔
مسجد کو اس قدر کلیدی اہمیت +اس لیے حاصل ہے کہ اس میں مرد، عورت، بوڑھے، جوان اور بچے رات و دن آتے جاتے رہتے ہیں۔ نماز باجماعت ادا کرتے ہیں، قرآن کی تلاوت کرتے ہیں، جمعہ و عیدین کے خطبے سنتے ہیں۔ غرضیکہ مسجد ایک بہت بڑا ذریعہ ہے مسلمانوں کے مابین باہمی روابط اور دینی ربط و تعلق کا۔ یہیں سے

ان کو روحانی اور دینی غذائیں ملتی ہیں۔

لیکن ان فوائد کے بہترین نتائج اسی وقت حاصل ہو سکتے ہیں جب ان مساجد میں باصلاحیت امام ہوں۔

جتنی ضرورت مدارس میں اچھے مدرسین کی ہوتی ہے اتنی ہی ضرورت مساجد میں اچھے ائمہ کرام کی۔

مگر افسوس کہ مسلم معاشرہ آج کل یہاں بھی تنگ دامنی کا شکار ہے۔ پہلے زیادہ تر مساجد میں صوفیاء کرام یہ فریضہ انجام دیتے تھے۔ ان میں کچھ یہ ذمہ داری بحسن وخوبی نبھا کے عنداللہ ماجور ہوئے اور کچھ نے اس منصب کا غلط استعمال کیا۔

اگر مساجد کے ائمہ کرام تھوڑی سی توجہ دیں اور خدا نے انھیں جو منصب عطا فرمایا ہے اس کا پوری دیانت داری اور ذمہ داری سے حق ادا کریں تو اس سے پوری امت اسلامی کو بے پناہ فیض پہنچ سکتا ہے۔

اس امت میں سادھو سنت جیسے لوگ نہیں ہوتے اور نہ ہی پادری اور بابائے اعظم جیسے مذہبی اجارہ دار ہوتے ہیں۔ صرف اہل ذکر اور اہل رائے ہوتے ہیں اور انھیں دونوں پر امت کی رہنمائی کا فریضہ عائد ہوتا ہے۔

وعظ ونصیحت

وعظ ونصیحت مختصر ہونی چاہیے۔ حضورؐ نے بہت کم لمبے خطبات دیے ہیں یا زیادہ دیر تک وعظ ونصیحت کی ہے۔

جمعہ یا دیگر مواقع پر حضورؐ کے خطبات یا لوگوں اور جماعتوں سے آپ کی گفتگو زیادہ سے زیادہ چند منٹوں تک محدود رہی ہے۔

لیکن یہ سب کے سب مختصر ترین حکمت سے بھرپور کلمات ہوتے تھے جنھیں آپ انگلیوں پر شمار کر سکتے ہیں۔

آج کل کے خطیب یا واعظ حضرات تو اس عادت کے برعکس لمبی لمبی تقریریں کرتے ہیں، کچھ واعظ حضرات تو ایک گھنٹہ، دو گھنٹہ بلکہ تین تین گھنٹے تک بغیر رکے ہوئے بولتے جاتے ہیں۔

تین گھنٹے بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ اتنی دیر میں تو ایک شخص ایک تہائی قرآن پڑھ لے گا جسے اللہ تعالیٰ نے پورے تیئس سالوں میں اتارا ہے۔

پھر یہ بھی تو دیکھئے کہ یہ حضرات ان پورے تین گھنٹوں میں بولتے کیا ہیں؟ ان کی بیشتر باتیں لغویات، دور کے معانی ومطالب، تکرار، غلو پر مشتمل ہوتی ہیں اور پھر طے شدہ موضوع سے بھی کوسوں دور ہوتی ہیں۔

افسوس تو اس بات کا ہے کہ عوام بھی عقل وخرد کو بالائے طاق رکھ کر کمال مدہوشی کے ساتھ ان بے معنی باتوں کو سننے کے عادی ہو چکے ہیں۔ چھوٹے سے انسانی دماغ میں بہت سی باتیں بیک وقت کیسے سما سکتی ہیں اور پھر باتیں سنتے سنتے کان بھی تو پک جاتے ہیں۔ اس لیے لمبی چوڑی تقریریں بے اثر ثابت ہوتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آج کل لوگوں پر تقریروں اور وعظوں کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

ہماری مسجدوں میں سمجھدار واعظوں اور خطیبوں کی کمی ہے۔ اکثر کو تو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ کیا اور کیسے بول رہے ہیں۔ اچھے واعظ اور سمجھدار خطیب پیدا کرنے کی ذمہ داری ہمارے عربی مدارس کی ہے۔ جہاں ایک مستقل شعبہ قائم کر کے خطابت کی باقاعدہ تعلیم وتربیت ہونی چاہیے۔

لیکن افسوس ہے کہ ہمارے دینی مدرسوں میں اس قسم کی تعلیم وتربیت کا کوئی انتظام نہیں ہے جس کی وجہ سے مسلم عوام علماء سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کے درمیان ایک خلیج بن چکی ہے جو بجائے اس کے کہ پُر ہو، دن بدن بڑھتی ہی جا رہی ہے۔

☆☆☆

باب۔۴

بدعاتِ عادات

مخصوص رسم ورواج

مشرقی لوگوں کے اپنے مخصوص رسم و رواج ہوتے ہیں جن کی وہ پابندی کرتے ہیں۔ یہ رسم ورواج صرف انہی تک محدود ہوتے ہیں۔

کچھ لوگ ان مخصوص رسم ورواج اوران کی پابندی کودیکھ کر یہ فیصلہ کرلیتے ہیں کہ ان رسم ورواج کا تعلق ان کے دین ومذہب سے ہے۔

یہ اندازفکر قطعی غلط اور حقیقت سے کوسوں دور ہے۔

مشرقی ملکوں کے یہ رسوم ورواج اسلامی اصولوں پرمبنی نہیں ہیں اور نہ ہی ان کا حکم اللہ نے دیا ہے۔

ان رسموں اور رواجوں پرتو، خواہ وہ کتنا ہی رواج کیوں نہ پائے گئے ہوں، حکم لگایا جاسکتا ہے لیکن ان کی بنیاد پر کوئی حکم لگایا نہیں جاسکتا۔

یہ رسم ورواج خواہ ان کی جڑیں سماج میں کتنی ہی پیوست کیوں نہ ہوں اکثر و بیشتر باطل محض یا حق وباطل کا مجموعہ ہوتے ہیں۔

اورحق وباطل کا فیصلہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ کے ذریعہ کیا جائے گا۔

ہمیں اس حقیقت کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے کہ اگر کوئی شخص اپنی عقل وخرد کو بالائے طاق رکھ کر بغیر سوچے سمجھے اپنے پُرکھوں کی راہ پر چلنا شروع کردیتا ہے، تو ایسا شخص اپنے ارادہ اوراپنی سوچ دونوں اعتبار سے اسلام کے راستے سے ہٹ جاتا ہے۔

ماضی میں نہ جانے کتنی قومیں اپنے باپ داداؤں کی اندھی تقلید میں گمراہ ہوکر تباہ وبرباد ہوچکی ہیں۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے:

انهم الفوا آبائهم ضالين، فهم على آثارهم يهرعون ولقدضل قبلهم اكثر الاولين، ولقدار سلنا فيهم منذرين فانظر كيف كان عاقبة المنذرين الا عباد الله المخلصين ﴿الصافات: ٧٤-٦٩﴾

انھوں نے اپنے آباء واجداد کو گمراہ پایا اب یہ بھی ان کے نقش قدم کے پیچھے دوڑے جا رہے ہیں اوران سے پیشتر پہلے کے لوگوں کی اکثریت گمراہ ہو چکی ہے جبکہ ان میں ہم نے ڈرانے والے بھیجے تھے۔ اب تم دیکھو کہ ان ڈرائے گئے لوگوں کا انجام کیا ہوا سوائے اللہ کے مخلص بندوں کے۔

ان مشرقی لوگوں کی غم اور خوشی دونوں میں کچھ مخصوص عادات ہوتی ہیں جن کی تقلید میں وہ بے جا غلو اور فضول خرچی کرتے ہیں۔

اسی طرح وہ مخصوص انداز میں دوستوں اور مہمانوں کے ساتھ بھی معاملہ کرتے ہیں۔ عورتوں کے ساتھ ان کے سلوک، معاملات اوران کے تحفظ وغیرہ کے معاملہ میں بھی ان کا اپنا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ اپنی زندگی جینے کا ان کا ایک ڈھنگ ہوتا ہے۔ اسی طرح خوشیوں اور تیوہاروں میں جمع ہونے اور پھر جدائی کا بھی ایک مخصوص طریقہ ہوتا ہے۔

ان رسوم ورواج میں کچھ اچھائیاں بھی ہوتی ہیں اور کچھ خرابیاں بھی۔ ان میں سے کچھ قابل قبول ہیں اور کچھ قابل رد۔

لیکن یہ بہت بڑا ظلم ہوگا اگر ہم ان رسوم ورواج کا بوجھ اسلام کے کندھوں پر رکھ دیں۔ کیونکہ اسلام نے جس طرز زندگی کی بنیاد ڈالی ہے وہ مشرقی اور مغربی دونوں رسم ورواج سے کہیں بالا وارفع ہے۔

کبھی کبھی تو بہت ہی بے دردی کے ساتھ ان رسوم ورواج کو دین کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے جبکہ بے چارے مذہب کا ان سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔

مثال کے طور پر بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عربی لباس جنھیں کچھ لوگ سادہ لوحی سے اسلامی شعار سمجھ بیٹھے ہیں اور یہ باور کرتے ہیں کہ عربوں کے مخصوص لباس، جیسے جبہ وعمامہ جن میں علماء ازہر وغیرہ نظر آتے ہیں، کا حکم دین ومذہب نے دیا ہے۔

اب آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ جن لباسوں کو آپ عربی کہتے ہیں اور جن لباسوں کو

آپ یورپی کہتے ہیں ان کے فائدہ نقصان، آرام و تکلیف، خوش ذوقی اور بدذوقی میں کس قدر واضح فرق ہے۔

یہ لباس ایک گروہ کے لیے تو مناسب ہیں مگر دوسرے کے لیے نہیں۔ اسی طرح یہ ایک ماحول کے لیے تو سازگار ہیں لیکن دوسرے ماحول کے لیے نہیں۔

ان لباسوں کے زیب تن کرنے والوں کی نیت کیا ہوتی ہے۔ یہاں پر میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ ہاں، بہت سارے ایسے لوگ بھی ہیں جو یورپی لباسوں میں اپنے آپ کو ہر قید و بند سے آزاد سمجھنے لگتے ہیں، لہٰذا لباس کی تبدیلی الگ چیز ہے اور نیت کی الگ۔

اگر کوئی شخص حضور اکرمؐ کی چادر مبارک بھی بُری نیت سے زیب تن کرے تو وہ اللہ کے عذاب سے ہرگز ہرگز نہیں بچ سکتا۔

لباس کی طرح مشرقی اور مغربی حماموں وغیرہ میں بھی بہت فرق ہوتا ہے۔ ان میں کچھ اچھائیاں بھی ہوتی ہیں اور برائیاں بھی۔

آپ ان حماموں وغیرہ کو اسلامی اور غیر اسلامی خانوں میں بانٹ نہیں سکتے۔

مشرقی ممالک کے لوگ بیت الخلاء میں کاغذ کا استعمال کرنے میں قباحت محسوس کرتے ہیں۔ یہ بہت غلط بات ہے۔ عرب اور دیگر مشرقی ملکوں کے لوگ پتھر کا استعمال کرتے ہیں۔ پتھر کے مقابلہ میں یہ کہیں زیادہ صاف ستھری چیز ہے، اگر کوئی کاغذ اور پانی دونوں کا بیک وقت استعمال کرے تو پھر کیا کہنا۔

قدیم زمانہ میں کاغذ کا استعمال اس وجہ سے نہیں ہو سکا تھا کہ اس وقت وہ موجود ہی نہیں تھا۔ اگر آج کل اس کی بہتات ہے تو اس کے ترک کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

مشرقی ملکوں میں مختلف قسم کے طرز تعمیر کا رواج ہے کچھ میں مشرقیت ہوتی ہے تو کچھ خالص مغربی طرز کے۔ ہر طرز کا ایک الگ رنگ ہوتا ہے اور خوبصورتی بھی۔ ان میں کچھ قدیم ہیں اور کچھ جدید۔

ان مختلف قسم کی تعمیرات پر اسلامی اور غیر اسلامی وغیرہ کا لیبل نہیں چسپاں کیا جا سکتا۔ اگر ایسا کیا جاتا ہے تو بڑی حماقت کی بات ہوگی۔

میرے نزدیک کسی گھر میں لگی ہوئی سادہ کھڑکی کسی عبادت گاہ میں لگی ہوئی

پیچیدہ نقش ونگار اور رنگین کھڑکی سے کہیں زیادہ بہتر ہوگی۔

ہم یہ بات پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ دنیاوی معاملات میں اسلام نے دخل اندازی نہیں کی ہے۔ آپ جو چاہیں اور جیسے چاہیں نئی نئی چیزیں ایجاد کریں۔کوئی روک ٹوک نہیں اور نہ ہی کوئی قدغن ہے۔

زندگی کی انہی سرگرمیوں کو استعمال کر کے قومیں اقتصادی، علمی اور سائنسی ترقی اور مختلف مقاصد حاصل کرتی ہیں۔ کچھ قابل تعریف اور کچھ قابل نفرت۔

اور یہیں سے رسالت کا مقدس فریضہ شروع ہوتا ہے جو انسانی قوتوں کو مسخر کر کے انھیں نیکی اور بھلائی کے کاموں میں لگا دیتی ہے۔

اسلام انسانی زندگی میں حسن نیت اور حسن عمل پیدا کر کے اس کی ساری زندگی کو عبادت بنا دیتا ہے۔اس کے دنیاوی زندگی سے متعلق جملہ امور بھی اللہ تعالیٰ کے تیئں بے پایاں خلوص کے مظہر ہو کے نماز روزہ، حج اور زکوٰۃ کی طرح تقرب الی اللہ کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

لیکن اسلام نے زندگی کی حقیقتوں کا سامنا کرنے کے لیے جس طرح اختراع اور ایجاد کی حوصلہ افزائی کی ہے اسی طرح دینی حقیقتوں میں کسی بھی ردوبدل کی حوصلہ شکنی کی ہے۔

اسی لیے عبادات میں سنت کی اتباع ضروری ہے اور اپنی عقل سے عبادات میں اضافہ کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ایسی عبادت نہ صرف یہ کہ بے سود ہوگی بلکہ خدا کے اس فرمان کی زد میں ہوگی:

فماذا بعد الحق الا الضلال فانی تصرفون ﴿یونس:۳۲﴾

حق کے بعد گمراہی کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے پھر تم لوگ الٹے کہاں چلے جا رہے ہو۔

ہمیں دین میں اتباع اور دنیا میں ایجاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔اس سے ہم صحیح منزل کی طرف گامزن ہوں گے اور ہمارے اخلاق وعادات میں بھی سدھار ہوگا۔

اب اگر مسلمان اس آیت کے برعکس عمل کریں۔ جہاں ایجاد کرنی ہو وہاں جمود اختیار کرلیں اور جہاں پر جمود کا حکم ہو وہاں ایجاد شروع کردیں تو اس غلط طرز عمل سے نہ صرف یہ کہ ان کی دنیا تنگ ہو جائے گی بلکہ ان کے دین میں بھی فساد پیدا ہو جائے گا۔

دین کے فساد کا صلہ تو بہت دیر بعد آخرت میں ملے گا لیکن دنیاوی فساد کا صلہ فوری طور سے اسی دنیا ہی میں مل جاتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کو بھی دنیا کے تمام میدانوں میں مسلسل ناکامیاں ہی ناکامیاں مل رہی ہیں۔

ایک صحیح مسلمان جب یہ صورت حال دیکھتا ہے تو کف افسوس ملنے لگتا ہے۔ وہ بڑی حسرت کے ساتھ دیکھتا ہے کہ اس کی قوم دنیا کے تمام میدانوں میں پیچھے ہے۔ جبکہ دوسرے آسمانی مذاہب کے لوگ یہاں تک کہ خود ساختہ زمینی مذاہب کے لوگ بھی ترقی کی دوڑ میں ان سے کافی آگے نکل گئے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہوا؟

کیوں کہ اسلام کو سمجھنے میں ان کی غلطی نے زندگی کے اصل مقصد کو بھی غلط رنگ میں پیش کیا۔ اس طرح وہ یہاں اور وہاں، ہر طرف بھٹکتے ہی رہے اور پھر کسل مندی اور جمود کی مہیب تاریکی میں ڈوب گئے۔

ہر امت شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے خدائے عز و جل کی صحیح طور سے عبادت کر سکتی ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ وہ اپنی راہ میں خود ساختہ دیواریں کھڑی کر لیتی ہے پھر یہی دیواریں کسی فالج کی طرح اس کی حرکت میں بادھا ڈال دیتی ہیں اور پھر صرف یہی نہیں کہ اس کا چین و سکون غارت ہو جاتا ہے بلکہ اس کا مستقبل بھی تاریک ہو جاتا ہے۔

جنازے کی بدعتیں

کسی عزیز کے انتقال پر اس کے عزیز و اقارب کو دو غموں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک تو عزیز کے بچھڑنے کا غم دوسرے فوری اخراجات کی فکر۔

یہ بے جا اخراجات نہ صرف یہ کہ ایک قسم کا مالی تاوان ہیں بلکہ اخلاقی اور افرادی قوت کا بھی ضیاع ہیں۔

موت کے وقت یہ بے جا رسم بدعات اور گناہوں کا ایک بدترین امتزاج ہے۔ میت کے عزیز و اقارب معاشی تنگی کے باوجود بھی یہ غلط رسم ادا کرتے ہیں یا اس رسم کی ادائیگی پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔

میں نے بہت سے غریب لوگوں کو بھی دیکھا ہے جو قرض لے کر ان رسوم کو

نبھاتے ہیں کیونکہ ان کے دلوں میں یہ خیال پیوست کر گیا ہے کہ یہ بھی شریعت کا حکم ہے اور اس کی ادائیگی لازمی ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک طرف تو میت کی لاش تدفین کے لیے تیار کی جاتی ہے تو دوسری طرف مہمانوں کے استقبال کے لیے قیام و طعام کا بندوبست کیا جاتا ہے۔

بسا اوقات گھر کے سامنے خیمہ تک نصب کرنا پڑتا ہے یا شامیانہ لگایا جاتا ہے، جس میں ماتم پرسی کرنے والے حضرات بیٹھتے ہیں اور پھر کھانا وغیرہ کھاتے ہیں۔

یہی بات چالیسویں کے نام پر پھر دہرائی جاتی ہے۔ اس کے بعد پھر پہلی برسی، دوسری برسی اور پھر برسیوں کا ایک طویل سلسلہ۔

یہ رسم دینی اور دنیاوی دونوں اعتبار سے غلط اور قابل مذمت ہے۔

گذشتہ جنگ عظیم میں اکیلے جرمنی کے ایک کروڑ اشخاص مارے گئے تھے۔ انھوں نے اپنے مردوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟

انھوں نے ان مقتولین کو خاموشی کے ساتھ دفن کر دیا اور زندگی کی جدوجہد میں جٹ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ چند سالوں کے اندر انھوں نے اپنے نقصان کی تلافی کر لی۔

ایک ہم ہیں کہ اپنے ایک فوت شدہ شخص کا ماتم پورے چالیس روز تک اور پھر سالہا سال تک کرتے رہتے ہیں۔ ایسے حالات میں اگر لاکھوں لوگ فوت ہو جائیں تو پوری قوم سالہا سال تک ماتم ہی میں گذار دے گی۔

تین دن تک سوگ منانا پھر چالیسواں اور پھر برسی وغیرہ منانا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ عام اور خاص سبھی اس موذی مرض میں مبتلا ہیں اور اسے دین کا ایک جز سمجھتے ہیں۔

ہمارے خطیب اور واعظ حضرات مسلمانوں کو اس موذی بدعت سے چھٹکارا دلانے میں ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔

بہت سی جگہوں پر اس کے جواز اور رواج کو تقویت بخشنے کے لیے ان مواقع پر قرآن خوانی اور وعظ و نصیحت کا بھی اہتمام کیا جانے لگا ہے۔ اس رسم کو دینی رنگ دینے کی کوشش نے معاملہ کو اور بھی نازک بنا دیا ہے۔

جبکہ اس کا علاج صحیح طور سے سنت نبوی کی اتباع سے کیا جاتا تھا۔ اس طرح ان ساری رسومات اور خرافات کی مکمل بیخ کنی ہو جاتی۔

ایسے معاملات میں اسلام کی سنت یہ ہے کہ انسان اللہ کے فیصلے کا صبر و ہمت کے ساتھ سامنا کرے۔ اپنے دل میں گریہ وزاری، آہ و بکا کو جگہ نہ دے۔ وہ زیادہ دنوں تک غموں کو پال کے نہ رکھے۔

ہونا تو یہ چاہئے کہ وہ اس المیہ کے بعد اپنی زندگی کو از سر نو شروع کرے، اپنے رب کی مزید معرفت کے ساتھ، اس کے احکام کی تعمیل کے ساتھ اور جو کچھ خدا نے اس کے لیے مقدر کر رکھا ہے اس کی توقع کے ساتھ۔

حضورؐ نے فرمایا ہے:

من استرجع عندالمصيبة جبرالله مصيبته واحسن عقباه وجعل له خلفا يرضاه.

جس نے مصیبت کے وقت انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اللہ اس کی مصیبت کی تلافی کر دے گا۔ اس کا ٹھکانا اچھا بنائے گا اور اس کا جانشین اس کو بنائے گا جس کو یہ پسند کرے گا۔

کسی مسلمان مرد یا عورت کے لیے ماتمی لباس پہننا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح اپنے بدن میں، صورت میں، گھر میں یا افعال میں ماتمی شعار اپنانا ناجائز ہے۔

اس دنیا سے کسی زندہ شخص کے عالم آخرت میں چلے جانے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس دنیاوی زندگی میں انتشار فساد اور ماتم برپا ہو جائے۔

ہمارے بزرگوں سے یہی منقول ہے کہ مرنے والا مر گیا اب زندوں کو تو زندہ رہنا چاہیے۔

چونکہ مردوں کے مقابلے میں عورتیں زیادہ جذباتی ہوتی ہیں اور رنج و غم کا اثر زیادہ قبول کرتی ہیں اس لیے اسلام نے ان کے سوگ کی مدت متعین کر دی ہے۔

حضورؐ کا ارشاد ہے:

لا يحل لامرأة تؤمن بالله واليوم الاخران تحد على ميت فوق ثلاث ليال الا على زوج اربعة اشهر وعشرا.

کسی عورت کے لیے جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتی ہو یہ جائز نہیں ہے کہ وہ تین راتوں سے زیادہ سوگ منائے لیکن صرف شوہر کے لیے وہ چار ماہ اور دس دن تک سوگ منا سکتی ہے۔

یہ حکم عورت کے تمام رشتہ داروں کے لیے ہے کہ وہ تین دن سے زیادہ سوگ نہ منائیں۔ سوگ نہ منانے کا مطلب ہے زیب وزینت، خوشبو وغیرہ کا استعمال نہ کرنا۔

لیکن شوہر کا معاملہ دیگر ہے۔ عورت کے ساتھ اس کا تعلق اور اس کی حیثیت اور پھر عورت کے مستقبل میں تبدیلی اسے مزید مدت تک سوگ منانے پر مجبور کرتی ہیں۔ لیکن عدت پوری ہونے پر پھر وہ حسب سابق زیب وزینت کی زندگی میں واپس جاسکتی ہے۔

اس موقعہ پر میں مسلمانوں کی توجہ ایک دوسرے مسئلہ کی طرف بھی مبذول کرانا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ جنازے کے ساتھ شور وشغب یا اونچی آواز کے ساتھ کچھ بھی نہیں ہونا چاہیے یہاں تک کہ قرآن کی تلاوت اور اللہ کا ذکر بھی۔

پہلے ایسے موقع پر پیشہ ور نوحہ گروں کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں لیکن اسلام نے اس بات سے سختی کے ساتھ منع کیا ہے۔

صاحب ''مدخل'' رقم طراز ہیں ''نوحہ یا ماتم رسول اللہؐ، صحابہ کرامؓ اور سلف صالحینؒ کی سنت کے خلاف ہے اور حسب طاقت سختی کے ساتھ اس کو روکنا چاہیے''۔

کہیں کہیں تو گریبان چاک کیے جاتے ہیں، سینہ کوبی ہوتی ہے اور گالوں پر تھپڑ برسائے جاتے ہیں۔ یہ سب باتیں ہمارے اسلاف کے جنازوں میں نہیں ہوتی تھیں۔

ہمارے اسلاف کے جنازوں میں خشوع اور وقار ہوتا تھا یہاں تک کہ میت کے سب سے نزدیکی عزیز کا امتیاز بھی مشکل ہو جاتا تھا کیونکہ بھی لوگوں کے چہروں پر غم یاس اور ملال کے اثرات ہوتے تھے کیونکہ ہر جنازے کے ساتھ انھیں یہ احساس ہوتا تھا کہ عنقریب ان کے ساتھ بھی یہی سب کچھ ہونے والا ہے۔

حسن بصری کا قول ہے، ''کل کے مردہ آج کے مردہ کے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں''۔ ایک شخص کے جنازے میں جب کسی شخص نے یہ کہا کہ اپنے بھائی کے لیے مغفرت طلب کرو تو حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا خدا تمہاری مغفرت نہ کرے۔ کیونکہ وہ شخص یہ بات بلند آواز سے کہہ رہا تھا۔

اسی وجہ سے ہم جنازہ کے ساتھ کسی بھی قسم کے شور و ہنگامہ، آہ وبکا، یہاں تک کہ بلند آواز کے ساتھ قرآن کی تلاوت اور ذکر واستغفار سے بھی منع کرتے ہیں۔

یہی اسلامی شعار ہے اور اسی پر ہمارے اسلاف کاربند رہے ہیں۔

اسلام نے تعزیت کرنے کا حکم دیا ہے لیکن چلتے پھرتے۔ اہل میت کو اس کے لیے اہتمام کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

ہمارے سلف صالح اسی طرح تعزیت کیا کرتے تھے۔ اپنی ضروریات سے واپسی میں ملاقات کرتے اور پھر واپس ہو جاتے۔

لیکن بعد میں صورت بدل گئی۔ اہل میت کے لیے تعزیت کی جگہ بنانی پڑتی ہے اور پھر کھانے پینے کا انتظام بھی۔

جب حضرت جعفر ابن ابو طالبؓ کی شہادت ہوئی تو حضورؐ نے فرمایا آل جعفر کے لیے کھانا بنا دو کیونکہ وہ اپنے غموں سے نڈھال ہیں۔

فقہاء کا کہنا ہے کہ اہلِ میت کی طرف سے لوگوں کو کھانا کھلانا مکروہ ہے کیونکہ یہ بدعت میں مددگار ہوتی ہے۔

امام احمدؒ ابن حنبل اسے جاہلیت کا فعل قرار دیتے ہوئے اس کی شدید مذمت کرتے ہیں۔

حضرت جریر بن عبداللہؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم اہل میت کے گھر پر جمع ہونے اور دفن کے بعد کھانا کھلانے کو نوحہ قرار دیتے تھے اور اسے زمانہ جاہلیت کا عمل سمجھتے تھے۔

افسوس تو یہ ہے کہ جاہلیت کی یہ قدیم رسم ہمارے درمیان پھر واپس لوٹ آئی ہے اور ہم خاموشی کی ساتھ اسی پر عمل پیرا ہیں۔

☆☆☆

قبرستان صدقات تقسیم کرنے کی جگہ نہیں ہے میں نے دیکھا ہے کہ کچھ لوگوں نے اپنے مقبروں میں لوگوں کو کھانا کھلانے، پانی پلانے بلکہ ان پر پھول چڑھانے تک کے لئے اوقاف کرر کھے ہیں

دور جاہلیت میں مُردوں پر رحم طلب کرنے کے لئے قبروں پر جانور ذبح کئے جاتے تھے اسلام نے اس رسم کی ممانعت کر دی۔ اب ایسا لگتا ہے کہ مسلمانوں نے اس کے بجائے پکے ہوئے گوشت کی تقسیم کو اپنا لیا جس کے ساتھ روٹی اور پھل وغیرہ

بھی ہوتے ہیں

یہ سب بدعت ہے جس کی کوئی اصل نہیں۔

میرے خیال میں آخرت میں شخصی جوابدہی کے اصول پر ایمان میں کمزوری ہی اس کا سبب ہے۔ مُردوں کو زندوں کے جن اعمال کے ثواب ملتے ہیں وہ حدیث میں صاف صاف بیان کئے جاچکے ہیں اب کرایے پر تلاوت قرآن کریم کرا کے ثواب پہنچانے کے بارے میں سوچنا بھی فضول ہے

میرے خیال میں کسی بھی امت نے ایسا نہیں کیا کہ وہ ہماری طرح اپنی کتاب کو زندوں کے لئے تو چھوڑ دے اور قبروں میں پڑھنے کا انتظام کرے

خوشیوں کے مواقع پر

اسباب کے اختلاف کے ساتھ خوشی کے مواقع پر مسلمانوں نے بری عادتیں اختیار کر رکھی ہیں اور سادگی واعتدال کے بجائے غلو اور تکلف سے کام لینے میں پاک چیزوں کے حلال ہونے کا استحصال کر کے وہ اس کا دائرہ اسراف تک بڑھا دیتے ہیں میں نے شام، مصر اور حجاز وغیرہ ہر جگہ کسی کی ولادت، کسی افسر یا دوست کے استقبال اور شادی وغیرہ کے مواقع پر ایسی تقریبات دیکھی ہیں جن میں حد سے زیادہ اسراف اور نمود و نمائش کی کارفرمائی تھی۔

دیگر قومیں ہمارے مقابلے میں ان معاملات میں زیادہ صحیح طرز عمل رکھتی ہیں یہی حال دنیا کی حلال وحرام لذتوں سے لطف اندوز ہونے میں بھی نظر آتا ہے

ہمارے یہاں جو نشہ کرتے ہیں وہ اتنی پی جاتے ہیں کہ مدہوش ہو کر گر پڑیں دیگر قوموں کے لوگ شراب نوشی میں بھی حد اعتدال سے نہیں بڑھتے

یہی صورت لباس میں سادگی اور زیب وزینت میں بھی ہے

☆☆☆

اور یہ خرابیاں اس وقت دیکھنے کو مل رہی ہیں جب اسلامی اقتدار کو دنیا کی قومیں روند کر پامال کر رہی ہیں۔ شکست خوردہ لوگوں کو تو مباح آسائشوں سے بھی دور رہنا چاہئے تھا پھر جب فتحمند توازن واعتدال سے کام لے اور شکست خوردہ بے اعتدالی

سے تو المیہ بہت سنگین ہو جاتا ہے۔

شکست خوردہ قبائل تو جاہلیت میں بھی لذتیں ترک کر دیتے تھے یہاں تک کہ شکست کا بدلہ نہ لے لیں۔ خود (حضرت) ابو سفیانؓ نے غزوۂ بدر کے بعد قسم کھالی تھی کہ وہ جب تک شکست کا بدلہ نہ لے لیں نہ عورت کے قریب جائیں گے نہ خوشبو استعمال کریں گے۔

مسلمانوں کے لئے تو یہ بات زیادہ مناسب تھی کہ وہ اپنی تقریبات کو نمود ونمائش سے دور دور رکھیں اور حالات کے مطابق اپنے دین کی تعلیمات پر کاربند ہوں۔

اسلام میں تو ہر چیز میں سادگی ہی سنت ہے

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں: ہمیں تکلف سے منع کیا گیا ہے

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار فرمایا ''متنطع ہلاک ہو گئے'' (یعنی فطری طریقہ چھوڑ کر تکلفات میں پڑنے والے)

حضرت انسؓ بن مالک فرماتے ہیں کہ صحابہؓ اپنے ساتھیوں کے سامنے سوکھی روٹی کے ٹکڑے اور معمولی کھجوریں تک، جو کچھ موجود رہتا تھا، پیش کر دیتے تھے اور کہتے تھے کہ معلوم نہیں کون زیادہ گناہ گار ہوگا، وہ جو اپنے سامنے پیش کی جانے والی چیز کو حقیر سمجھتا ہے یا وہ جو اپنے پاس موجود چیز کو پیش کرنے کو حقیر سمجھتا ہے

مطلب یہ ہے کہ آدمی کے پاس جو کچھ ہے وہی پیش کر دے اپنے آپ کو تنگی وتکلف میں نہ ڈالے۔ اس کا مطلب کنجوسی نہیں ہے کہ مہمان کے سامنے بہر حال معمولی چیز پیش کرے۔

حضرت ابراہیمؑ کو دیکھئے جیسے ہی ان کے پاس کچھ (فرشتے) مہمان آئے تو یہ جانے بغیر کے وہ بھوکے ہیں یا نہیں یا کھائیں گے یا نہیں آپ بغیر طلب کے گھر میں گئے اور جلدی سے بچھڑا ذبح کر کے بھون کر لے آئے

شادی کے ولیموں میں خرچ کرنا مناسب ہے لیکن اسراف یہاں بھی نا مناسب ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں جس دن حضرت عائشہؓ رخصت ہو کر آئیں کھانے کے نام پر صرف ایک پیالہ دودھ تھا

حضرت فاطمہؓ کی شادی کے موقع پر آپ نے مدعوئین کی ضیافت ایک سینی

کھجور سے کی تھی

ایک نبی کی بیوی اور بیٹی کی شادیاں اس سادگی سے ہوتی تھیں اور آج دیکھئے مسلمان اپنی شادیوں میں کس طرح انتہائی فضول خرچیاں کر رہے ہیں اور جو لوگ وسائل سے محروم ہیں ان کے لئے کتنی دشواریاں پیدا کر رہے ہیں

میلادو عرس

دیگر قوموں کی روایات میں یہ بھی ہے کہ وہ یوم ولادت اور نئے سال کی تقریبات جوش وخروش سے مناتے ہیں۔ اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ مسلمانوں میں جب کوئی نیک آدمی انتقال کر جاتا ہے تو اس کا مقبرہ بنا کر اسے زیارت گاہ سمجھ لیتے ہیں اور سال میں ایک یا دو بار وہاں عرس مناتے ہیں جو گناہ اور بدعت ہے

اس طرح کے مزارات آپ کو ہر مسلم علاقہ میں مل جائیں گے

کہا جاتا ہے قاہرہ کے فاطمی خلفاء، نے سب سے پہلے چوتھی صدی ہجری میں یوم میلاد النبیؐ، یوم میلاد امام علیؓ، یوم میلاد سیدہ فاطمہ زہرہؓ، یوم میلاد حضرت حسنؓ یوم میلاد حضرت حسینؓ اور اس وقت موجود خلیفہ کا یوم میلاد، یہ چھ تقریبات شروع کیں پھر افضل بن امیر الجیوش نامی حاکم نے انہیں روک دیا پھر حاکم بامر اللہ نے ۵۲۴ ھ میں پھر انھیں شروع کیا

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یوم میلاد النبی کی تقریب ساتویں صدی ہجری میں سب سے پہلے ملک مظفر ابو سعید نے شہر اربل میں منعقد کی پھر دھیرے دھیرے ہر طرف پھیل گئی

جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح طور پر فرمایا تھا: اپنے گھروں کو قبرستان اور میری قبر کو جشن کی جگہ نہ بنانا جہاں بھی ہو مجھ پر درود بھیج دو، وہ مجھ تک پہنچ جائے گا۔

جب خود آپ نے اپنی قبر مبارک کے لئے ایسا ناپسند فرمایا تھا تو دیگر لوگوں کی قبروں کے لئے کیسے پسندیدہ ہو سکتا ہے۔

پھر مزاروں پر عرس کے نام پر منعقد تقریبوں میں بہت سی معصیتوں کا ارتکاب

کیا جاتا ہے۔

ظالم حکمراں لوگوں کی توجہ اصل مسائل سے ہٹانے کے لئے انہیں داستانوں اور افسانوں میں مبتلا کرتے رہتے ہیں اس طرح نکتہ چینی سے بچ کر اپنا اقتدار مستحکم کرتے ہیں۔ اس طرح کی تقریبات کو رواج دینے میں بھی اسی طرح کے جذبات کارفرما تھے۔

انہی جذبات کے تحت الف لیلیٰ جیسی طول طویل داستانیں گھڑی اور پھیلائی گئیں۔ مزاروں پر عرسوں کا رواج بھی اسی سلسلے کی کڑی تھا۔

بدعت اور معصیت میں فرق

آخر میں یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ اسلامی سماج میں پھیلی ہوئی ہر عام برائی کو بدعت نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ان کا بدعت سے کوئی لینا دینا نہیں ہوتا بلکہ ان برائیوں کو معصیت اور گناہ کہا جاتا ہے۔ خواہ یہ گناہ بازاروں میں ہوں، گلی کوچوں میں ہوں یا مساجد جیسی جگہوں میں ہوں۔ اس سلسلے میں قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ ہر وہ کام جو شریعت کے اصولوں کے خلاف ہو وہ معصیت یا گناہ کہلاتا ہے۔ یہ کام شریعت کے مقرر کردہ اصولوں سے جس قدر دور ہوگا اتناہ ہی بڑا گناہ بھی ہوگا۔ اسی لیے گناہ کی دو قسمیں قرار دی گئی ہیں گناہ صغیرہ اور گناہ کبیرہ یعنی چھوٹا گناہ اور بڑا گناہ۔

لیکن یہی گناہ اس وقت بدعت بن جاتا ہے جب اسے عبادت یا تقرب الی اللہ سمجھ کر کیا جائے۔

☆☆☆

خاتمۂ کلام

اللہ تعالی کے لئے سچے عمل اور اس کے صحیح دین پر کاربند رہتے ہوئے ہمیں اپنی منزل مقصود کی طرف گامزن رہنا چاہیے، چاہے اس راستے پر ہمارے علاوہ کوئی اور چلنے والا نہ رہ جائے۔

اس کتاب کا خاتمہ اُن غرباء (اجنبیوں) کے تذکرہ کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں جن کے اردگرد باطل کا ڈیرہ جما ہوتا ہے، چاروں طرف جہالت، شقاوت اور کج روی کا دور دورہ ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ حق و انصاف کی قندیلیں جلائے ہوئے، خلوص عمل اور دین کی صحیح معرفت کے ساتھ اپنی منزل مقصود کی طرف رواں دواں ہوتے ہیں۔

اس زندگی میں حق سے ناواقف کاروں بلکہ حق کے منکرین کے جمگھٹوں میں رہتے ہوئے اُن غرباء پر آفریں ہے جو اپنی زندگی کی گاڑی کو ان غافلین اور خرمستوں کے درمیان پوری سلامت روی کے ساتھ چلا رہے ہیں۔

اس موقع پر ان غرباء کے بارے میں علامہ ابن قیمؒ نے ''مدارج السالکین'' میں شاندار بحث کی ہے۔

''بدمست و خرمست ساتھیوں کے بیچ ایک باعفت نوجوان، نماز سے بے گانہ لوگوں کے درمیان ایک نمازی شخص، بدعات و خرافات زدہ لوگوں کے ہجوم میں سنت کا پابند مسلمان اور اسلامی حرمت کی دھجیاں بکھیرنے والوں کے درمیان دینی ننگ و ناموس کا پاسبان۔ یہی لوگ درحقیقت غرباء ہیں۔ یہ لوگ تنہا ہوتے ہیں اگرچہ ان کے اردگرد لوگ ہوتے ہیں، انھیں تنہائی کا احساس ہوتا ہے اگرچہ ان کے آس پاس ہزاروں لوگوں کے دل دھڑک رہے ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ خود کو اکیلا نہیں سمجھتے کیونکہ وہ حق پر ہوتے ہیں اور اپنے سوا دوسروں کو اقلیت میں شمار کرتے ہیں کیونکہ وہ ناحق پر ہوتے ہیں۔

یہی عزت وناموس کا شعور اور خود احتسابی کا وجود ہر غریب میں پایا جاتا ہے۔

یہی شعور اور وجود کسی باڑھ کی طرح اس غریب کی جاہلوں کے غرور وانتقام سے حفاظت کرتا ہے اور وہ راستے کی رکاوٹوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف آگے بڑھتا ہی رہتا ہے۔

اس بات پر کوئی تعجب بھی نہیں۔لہروں کے خلاف تیرنے میں قوت بھی زیادہ صرف کرنی پڑتی ہے اور محنت بھی۔

غفلت شعار لوگوں میں رہتے ہوئے اللہ کے دین پر عمل کرنا، بداعمالیوں کے شکار لوگوں کے درمیان نیک بختی کی زندگی گذارنا بڑے حوصلہ کی بات ہے۔ایسے ماحول میں آپ اُس شخص کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو اصلاح حال کرنا چاہتا ہو اور کجی کو درست کرنا چاہتا ہو۔اور پھر اس شخص کی ہمت وقوت کا اندازہ لگایئے جو خرمستوں اور زر پرستوں کی بھیڑ میں اللہ کی خوشنودی کا طلب گار ہو۔

دراصل یہی وہ غرباء ہیں جن کی طرف حضورؐ کی حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے:

بدأ الا سلام غريبا و سيعود غريبا كما بدأ فطوبى للغرباء قيل ومن الغرباء يا رسول الله قال الذين يصلحون اذ فسد الناس۔

اسلام اجنبی پیدا ہوا ہے اور پھر اجنبی رہ جائے گا پہلے کی طرح، خوش خبری ہو اجنبیوں کو، لوگوں نے پوچھا کہ اجنبی کون ہیں اے رسول اللہ! آپ نے فرمایا وہ نیک بنے رہتے ہیں جب لوگ خراب ہو جائیں۔

غرباء کی تعریف میں حضورؐ سے متعدد روایتیں منقول ہیں، ایک روایت میں قبائلی عصبیت سے دور رہنے والے کہا گیا ہے۔دوسری روایت میں غرباء کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے ''کم نیک بخت لوگ زیادہ بد بختوں کے درمیان، ان کی نافرمانی کرنے والے زیادہ اور اطاعت کرنے والے کم ہوں گے۔ایک تیسری روایت میں غرباء کے بارے میں کہا گیا ہے۔''اپنے دین کے ساتھ فتنوں سے بھاگنے والے۔چوتھی روایت میں غرباء کی تعریف میں بتایا گیا ہے ''جو میری سنت کو زندہ رکھیں گے اور لوگوں کو سکھائیں گے''۔

مذکورہ بالا تمام روایتوں کو جمع کرنے سے غرباء کی جو واضح تصویر ابھر کے آتی ہے اس کا مطلب ہے جن کے دلوں میں ایمان کی حرارت ہوتی ہے اور خدا کی راہ میں

نہ تو انھیں لوگوں کے بد کنے کی پرواہ ہوتی ہے اور نہ ہی ارباب اقتدار کی تیوریوں پر بل پڑنے کی، وہ رنج وغم، آلام ومصائب کا جواں مردی کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں اور ان کے پائے استقامت میں ذرا بھی لغزش نہیں ہوتی۔

ایک روایت کے بموجب جب موسیٰؑ فرعون سے بھاگ کے مدین پہنچے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی حالت کا نقشہ یوں کھینچا تھا وہ اکیلے تھے، مسافر تھے، خوف زدہ تھے اور بھوکے تھے۔ انھوں نے کہا اے میرے رب میں اکیلا ہوں، مریض ہوں، اور مسافر ہوں!

ان سے کہا گیا: اے موسیٰ اکیلا وہ ہے، جس کا میرے جیسا کوئی ساتھی نہ ہو۔

اور مریض وہ ہے، جس کا میرے جیسا کوئی طبیب نہ ہو۔

اور مسافر وہ ہے، جس کا میرے اور اسکے درمیان کوئی معاملہ نہ ہو۔

انصاف کی بات تو یہ ہے کہ جب کسی شخص کا سینہ ایمان کے لیے کھول دیا جاتا ہے تو اللہ کی راہ میں زہر بھی میٹھا لگنے لگتا ہے، جیل خانہ خلوت بن جاتا ہے اور جلا وطنی سیاحت بن جاتی ہے اور قتل شہادت بن جاتا ہے۔

اور پھر اس طرح لوگوں سے اس کی اجنبیت اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ قربت اسے ایک ایسا منفرد شخص بنا دیتی ہے، جس کے دامن میں پوری امت جمع ہو جاتی ہے۔

انسان طبعی طور سے اجتماعیت پسند ہوتا ہے۔ دیگر لوگوں سے میل جول اس کی فطرت میں شامل ہے۔ لیکن جب اس کا سابقہ کم ظرفوں سے پڑتا ہے تو اس کی یہ انسیت وحشت میں بدل جاتی ہے۔

ایسے حالات میں وہ ان بے عمل اور کم ظرف لوگوں کے بجائے اپنی لو خدا سے لگا لیتا ہے اور اس طرح ذات باری ہی اس کی تنہائی کا مونس اور بے کسی کا غم خوار بن جاتی ہے۔ اور وہ عوام کی ہوس رانیوں اور خواص کی چیرہ دستیوں سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔

یہی نہیں وہ اپنی عادات و اطوار کو سنت رسول کے مطابق ڈھال لیتا ہے، جس کی بدولت اسے بے پناہ اطمینان حاصل ہوتا ہے اور پھر اسے نہ تو اپنی تنہائی کا غم ہوتا ہے اور نہ اپنی بے چارگی کا احساس۔

اور پھر فتنوں کے دور میں اللہ کی عبادت کو رسول خدا ﷺ نے اپنی مصاحبت

اور مدینہ کی طرف ہجرت کے برابر قرار دیا ہے۔

عبادة فى الهرج كهجرة الى. فتنوں کے دور میں عبادت میری طرف ہجرت کے مانند ہے۔

ایک مرد مومن کسی ایسی دنیا میں کسی طرح سکون کے ساتھ رہ سکتا ہے کہ خود تو وہ اس سے کنارہ کش ہو لیکن اس کے ارد گرد کے لوگ دنیا کی خرمستیوں کا شکار ہوں۔

اس موقع پر علامہ ابن قیمؒ کے یہ الفاظ قابل غور ہیں، ''جب ایک مرد مومن جسے اللہ تعالیٰ نے دین کے بصیرت عطا فرمائی ہے، سنت رسول اللہ کو سمجھنے اور اس پر چلنے کی توفیق دی ہے اور کتاب اللہ کا علم دیا ہے اور پھر اسے اللہ نے وہ چشم بینا بھی دی ہے جس سے وہ دیکھتا ہے کہ لوگ اللہ کے سیدھے راستے اور سنت نبوی کو چھوڑ کے بدعات وخرافات اور گمراہیوں میں مبتلا ہیں۔

تو وہ بھی ان لوگوں سے اپنا ناطہ توڑ کے اسی ڈگر پر چل پڑتا ہے جس پر حضورؐ اور ان کے اصحاب کفار مکہ کے دور میں چلے تھے۔

جب وہ انھیں صراط مستقیم کی طرف بلاتا ہے اور ان کے برے اعمال پر سرزنش کرتا ہے تو وہ قیامت برپا کر دیتے ہیں اور اس کے درپئے آزار بن جاتے ہیں۔

اس طرح وہ اجنبی ہوتا ہے اپنے دین میں کیونکہ دوسروں کا دین بگاڑ والا دین بن چکا ہوتا ہے۔

وہ اجنبی ہوتا ہے سنت میں ثابت قدم رہنے پر کیونکہ دیگر لوگ بدعت زدہ ہو چکے ہوتے ہیں۔

اجنبی ہوتا ہے اپنے صحیح عقیدہ میں جبکہ دوسرے لوگ بدعقیدہ ہو چکے ہوتے ہیں۔

وہ اجنبی ہوتے ہیں اپنی نماز میں کیونکہ دوسروں کی نمازوں میں فتور ہوتا ہے۔

اگر چہ اس معنوی غربت ہی کی وجہ سے وہ دیگر لوگوں سے ممتاز اور عالی مرتبہ ہوتا ہے لیکن بسا اوقات یہ غربت معنوی اور ظاہری دونوں اعتبار سے نمایاں ہو جاتی ہے۔

وطن سے دور رہنے والے لوگوں کی یہی غربت عزلت اور گوشہ نشینی کی وجہ ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود عالی ہمت لوگ اکثر وبیشتر اپنی جائے پیدائش کو خیر باد کہہ دیتے ہیں۔

ان عالی مرتبہ اور عالی ہمت افراد کی نظریں دور دراز کی دنیا پر ہوتی ہیں وہ ساری دنیا کی سیر کرتے ہیں اور صرف اسی جگہ ٹھہرتے ہیں اور اتنی ہی دیر پڑاؤ ڈالتے

ہیں جتنی دیر میں وہ اپنے مشن کو پورا کر لیں۔

اسی لیے ہجرت اور سفر ہر زمانے میں نیکی اور فضل وکمال کی علامت سمجھا جاتا رہا ہے۔

اور پھر یہ لوگ اس دنیا کو خیر باد کہہ کے آخرت کی طرف سفر کرتے ہیں تو وہاں پر اس سے بھی زیادہ وسیع وعریض دنیا یعنی جنت کی غیر محدود دنیا ان کے استقبال کے لیے اپنی باہیں کھول دیتی ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ ایک صحابیؓ کا مدینہ میں انتقال ہو گیا۔ ان کی پیدائش بھی مدینہ ہی میں ہوئی تھی۔ ان کی نماز جنازہ حضورؐ نے پڑھائی اور فرمایا کاش کہ اس کی موت اس کی پیدائش کی جگہ نہ ہوتی۔ ایک شخص نے دریافت کیا ایسا کیوں اے اللہ کے رسول؟ آپ نے فرمایا جب کسی شخص کا پردیس میں انتقال ہوتا ہے تو اس کی جائے پیدائش سے جائے وفات تک ناپ کے اتنی جگہ جنت میں دے دی جاتی ہے۔

ایک دوسری روایت میں مذکور ہے کہ حضورؐ مدینہ میں ایک قبر پر ٹھہرے اور فرمایا کاش کہ اس کی موت پردیس میں ہوتی۔

اگر مسلمانوں نے اس غربت کی فضیلت کو سمجھ لیا ہوتا تو آج دیگر اقوام سے کہیں پہلے دنیا بھر میں پھیل چکے ہوتے، خرابوں کو آباد کرتے، چھپے ہوئے خزانوں کو نکالتے اور بہت سے رازہائے سربستہ پر سے پردے اٹھاتے اور پھر اسلام کے عالمی پیغام کو دنیا کے کونے کونے میں پہنچاتے۔

لیکن افسوس صد افسوس کہ مسلمان اپنے گھروں میں پیر جمائے بیٹھ گئے اور پھر مفتوح ہو کے ذلیل وخوار ہوئے۔

اس کے برخلاف یورپی اقوام دنیا کے تمام کناروں اور تمام قوموں میں پھیل گئیں اور پھر ان پر حکمرانی کر کے سرخ رو ہوئیں۔

چونکہ غربت میں آدمی اپنے دوستوں اور ساتھیوں سے بچھڑ جاتا ہے۔ اس لیے اعلیٰ درجہ کی غربت وہ ہوتی ہے جس میں آدمی برابر آگے بڑھتا رہے پیچھے مڑ کے بھی نہ دیکھے یہاں تک کہ وہ اپنے نشان قدم اور غبار راہ سے بھی کافی آگے بڑھ جائے اور پھر ایک روز وہ اپنی شخصیت اور نشان کے ساتھ دور افق میں غائب ہو جائے۔

اس طرح زمان ومکان کی قیود سے ماورا یہ شخص دور افق سے ہدایت کی ایسی

شعائیں بھیجتا ہے جو لوگوں کے لیے مشعل راہ بن جاتی ہیں۔

یہی وہ لوگ ہیں جو مر کے بھی فنا نہیں ہوتے۔ وہ تو روشنی کا ایک مینار ہوتے ہیں جس سے پوری دنیا منور ہوتی ہے۔

ابن قیمؒ نے کیا خوب کہا ہے کہ عارف باللہ کی ہمت اپنے معروف یعنی اللہ کے اردگرد ایک حلقہ بنالیتی ہے اور اس طرح وہ آخرت اور دنیا دونوں کے باشندوں کے لیے اجنبی بن جاتا ہے ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ آخرت کا طالب شخص دنیاوی لوگوں کے درمیان اجنبی ہوتا ہے۔

ایسا شخص علمی اعتبار سے یکتائے روزگار ہوتا ہے کیونکہ اس کا افق کشادہ، اس کی سمجھ گہری، اس کی نگاہ تیز ہوتی ہے اور پھر اس کے جذبات بھی بالکل الگ نوعیت کے ہوتے ہیں کیونکہ اس کے دل و دماغ میں اللہ کی محبت کا نور جگمگاتا ہے، جس کی برکت سے وہ خویش واقارب اور بے گانوں سب کے لیے رحمت بن جاتا ہے۔

ایسا شخص اپنی عبادات میں بھی یگانہ ہوتا ہے کیونکہ عابد و زاہد لوگ اپنی اپنی عبادات میں مگن رہتے ہیں لیکن اس کی لو تو صرف اللہ سے لگی ہوتی ہے اور وہ بھی فرائض و عبادات کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ۔

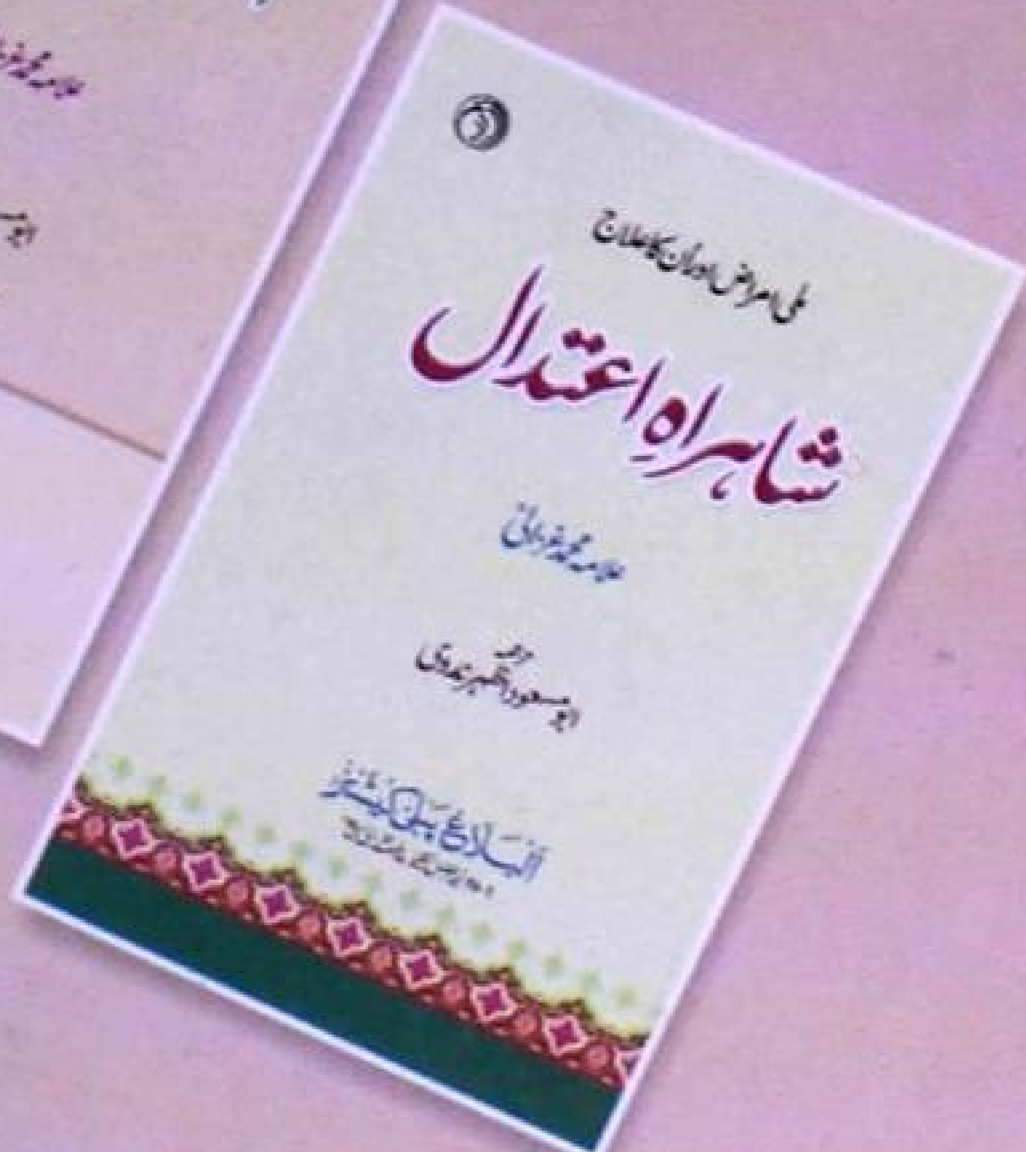
وہ اپنے سلوک اور عادات واطوار میں بھی منفرد ہوتا ہے کیونکہ غربت کے دوران وہ ایسے حقائق کا ادراک کرتا ہے جو دیگر لوگوں سے پوشیدہ ہوتے ہیں اس لیے اس کے اقوال وافعال کی حقانیت کا پتہ بہت بعد میں لگتا ہے اور وہ بھی کافی عرصہ بعد جب پیچھے رہ جانے والا کارواں ایک لمبی مسافت طے کرنے کے بعد وہاں تک پہنچتا ہے۔

اس غریب کے ہاتھوں میں وہ دوربین ہوتی ہے جس سے وہ غیب کے پردہ سے ظاہر ہونے والی باتوں کو دیکھ لیتا ہے۔ اس لیے وہ وہ ایسی چیزیں دیکھتا ہے جو دوسرے نہیں دیکھتے اور وہ ایسی چیزوں کے بارے میں اپنا فیصلہ صادر کر دیتا ہے جو دوسرے نہیں کر سکتے۔

اللہ تعالیٰ ایسے غرباء پر رحم فرمائے اور اپنے فضل و کرم سے ان کی قبروں کی وحشت کو دور کرے۔

☆☆☆





Al-Balagh Publications

N-1, Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar
New Delhi-110025, Mob.: +91 9971477664
E-mail: abpublications@gmail.com

ISBN 93-83313-84-6

9789383313846

قیمت : -/150